خوشبو کا بدن



شکیلؔ ابنِ شرفؔ

خوشبو کا بدن

شکیلؔ ابنِ شرفؔ

تاشہ گلی نمبر ۸، دھولیہ (مہاراشٹر)

نام کتاب خوشبو کا بدن

شاعر .... شکیلؔ ابن شرفؔ

سالِ اشاعت .... مارچ ۲۰۰۴ء

تعداد ۱۰۰۰

کتابت .... عنم آرٹ، دھولیہ۔

سرورق .... سونی آرٹ، دھولیہ۔

ناشر .... بزمِ محبانِ شکیلؔ، دھولیہ۔

قیمت .... سو ۱۰۰ روپئے

طباعت .... نورانی پریس، مالیگاؤں۔

☆ ملنے کے پتے ☆

مدینہ بک ڈِپو، مولوی گنج جامع مسجد، دھولیہ۔

شبنم بک اسٹال اینڈ جنرل اسٹورس، قصاب باڑہ مسجد شاپنگ سینٹر، دھولیہ۔

پروفیسر جمیل انصاری، علی شان کمیونیکیشن، بڑی مسجد کے سامنے، عثمان پورہ، اورنگ آباد۔

☆ انتساب ☆

اُن رُوحوں کے نام

جِن کے

فیضِ صحبت نے

ہر قدم پر رہنمائی کی

اور

زندگی کو برتنے کا سلیقہ عطا کیا !

''نشّہِ رنگ سے ہے وَا شُدِ گُل''

ادب نے جہاں انسان کے جمالیاتی احساس کی ترتیب وتہذیب کی ہے اور اُس کے جذبات واحساسات کو ملائمت اور لطافت بخشی ہے، تو وہیں جینے اور جیتے رہنے کے بیچ خوابوں کے سرور وانبساط، زندگی کے آشوب، جدّ وجہد وکشاکش کے اظہار میں آداب ہنر کے شعور کو متعین اور بیدار کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے آج بھی کسی قدر لفظ کی جو حرمت قائم ہے وہ ایسے ہی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے کردار کا حاصل ہے۔ جنھوں نے مفاد پرستی اور ہر قسم کی صلہ و ستائش کی تمنّا سے بے نیاز ہو کر علم وفن کی خدمت کی ہے اور جنھوں نے محض اپنی تخلیقات اور کلام کے توسط سے اپنی ادبی حیثیت کا تعین کرنا چاہا۔ کسی بھی ادب میں فنکار کے وزن ووقار کے تعین میں اسی روّیہ کو حقیقی طرزِ عمل تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا ادبی معاشرہ کبھی بھی ایسے مخلص ادیبوں، شاعروں سے خالی نہیں رہا۔ ایسے ہی ''حطۂ غیرت ومحبت'' دھولیہ سے ''رشتۂ جاں'' رکھنے والوں میں حضرتِ غریبؔ، حنیفؔ، کلیمؔ، انجمؔ، اکرمؔ، اثرؔ اور زاہدؔ جیسے باکمال اساتذۂ سخن اور ''سرمایۂ جاں'' لوگوں نے چراغ حرف کو روشن رکھنے اور سچے اور صادق جذبوں کی تہذیب میں ''جگرِ خوں'' کیا، تب دھولیہ کے کئی قابل ذکر شعراء نے دنیا کے شعروادب میں نام پیدا کیا اور عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ دھولیہ کے تعلق سے انہیں پہچانے ہوئے اور پہچانے جانے والوں میں شکیلؔ ابن شرفؔ ایک معروف ومعتبر نام ہے۔

شکیلؔ بنیادی طور پر ایک صحت مند شعری روایت، درد کی دولت اور حرمتِ حرف کا وارث ہے۔ چونکہ شکیلؔ کا عصری تصور ارضی ہے اور اُس کا ہمارے معاشرتی ورثے سے سیاقی تعلق ہے۔ اِسی لئے اُس کا کلام بھی ہمیں خاصا مانوس معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی شاعری جتنی خود آگاہ ہے اُتنی ہی خود آگاہ بھی ہے بلکہ اُس سے کچھ زیادہ ہے۔ شکیلؔ کو زمانۂ حال کے نئے نئے تجربات ومشاہدات کو فرد کی مجموعی صورت حال پر منطبق کر کے اُسے بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ اُس وقت اُس کا ''خروشِ گریۂ بے اختیار'' کچھ ایسا ہوتا ہے۔ کہ سیل رواں کی صورت شعری پیکروں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے لفظوں کے انتخاب کی شعری کوشش نہیں کرتے بلکہ

الفاظ کہیں متحرک پیکروں کی شکل میں اُس کے اشعار میں اپنے رنگوں کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔ اور قاری کے تمام حواس کو متاثر کرتے ہیں۔ شکیلؔ اپنی شاعری میں شہروں کے آشوب، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی ورثے کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ اِن موضوعات کو کسی ناصح کی طرح زیرِ بحث لانے کی بجائے دیانت دار فنکار کی طرح برتتے ہیں۔ وہ دوسروں کے مسائل اور دکھوں کو یوں پیش کرتے ہیں۔ جیسے وہ اُس کے ذاتی دکھ اور مسائل ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کی تگ ودو میں شکیلؔ محض ایک ''دردآشنا'' رویّے سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک عارف کی آگاہ دلی کے ساتھ اُس کام کے کرنے میں منہمک ہوجاتے ہیں۔ اُس کے عملی اور فکری اظہار اور مزاج کی اسی خوبی نے اُسے عزّت وتوقیر اور ہردلعزیزی عطا کی۔

شکیلؔ ابن شرفؔ نے بڑی سخت زندگی گزاری ہے۔ اور اُس کے چہرے کو نہایت قریب سے دیکھا ہے اور سچ مچ زندگی کے دکھ سُکھ بھوگے ہیں۔ بچپن ہی میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محرومی نے اُسے سرد وگرم حالات کی سختیوں اور دشواریوں کا اسیر بنادیا غیر محفوظیت کے احساس، غیریقینی حالات وتکلیف دہ معاشی دشواریوں نے حصول علم کی راہ روک دی۔ لیکن اِس محرومی کو شکیلؔ نے اپنی راہ کا روڑا بننے نہیں دیا۔ اُس نے بڑی پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ مساعد اور نامساعد حالات کی دھوپ چھاؤں کے اس سفر میں حوصلہ ہی اُس کا رہبر تھا۔ اُس نے اچھے بُروں کی صحبت اُٹھائی لیکن اپنی آنکھوں کو کھلی رکھا اور عقلِ سلیم کی روشنی میں زندگی کے سارے رنگ، ساری خوشبوؤں اور ساری آوازوں سے کسبِ فیض کیا۔ اِسی لئے اُس کی شاعری سچّے اور گہرے انسانی مطالعہ سے علاقہ رکھتی ہے۔

شکیلؔ کے مزاج کی رجائیت پسندی نے اسے اِس ''سوادِ بے حساں'' میں قنوطیت کی احساس زدگی سے نہ صرف بچالیا بلکہ آگے بڑھنے اور نئی منزلوں مرحلوں اور معرکوں کو سر کرنے کی توانائی بھی عطا کی۔ اُس نے شعوری طور پر جس راستے پر چلنے کا انتخاب کیا اُس پر پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ چل پڑے کشادہ دلی، وفاداری، لگن، خلوص اور بےلوث خدمت کا جذبہ حیات انسانی کے مختلف گوشوں کے اسرار ورموز کو اُس پر منکشف کرتا رہا اور یوں سچّے انسانی تجربات ومشاہدات کی بصیرت اُن کے فکروفن کا نور بنتی رہی۔ فیضؔ نے کہا ہے۔

جب تک نہ جلے چراغ دل کا   ہر شئے کا جمال رائیگاں ہے

شکیلؔ کے دل کا چراغ روشن ہوا تو درد کی دولت اور امانت غم کو سنبھالنے کی آزمائش اُس کا مقدر بنی۔ اُس کی ''حجابِ شب'' میں ''خوابوں کی تب وتاب'' کی نوازش فکر سخن میں ڈھل گئی۔ اُس کے ''اثاثۂ حرف'' میں بشارتوں اور بصیرتوں کا نور نمایاں ہوا تو ایسی توفیق فغاں ملی جو صرف اہل دل کا حصّہ ہے۔

سورج سیاہ شام کے نرغے میں ہے شکیلؔ　　　یوں ہی فصیل شب پہ چراغاں نہیں ہوا

عصری آگہی کا یہ بلند آہنگ لہجہ، شاعر کی فراستِ مومنانہ اور جراءتِ ایمانی کے بغیر کیا شعر بن سکتا تھا؟ نئے عالمی منظرنامے میں پیروانِ ابلیس، جس طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض ونفرت کی سلگتی ہوئی چنگاری کو شعلہ زن کردینے کو بے تاب ہیں۔ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے۔ خونِ مسلم کی ارزانی اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں کے پس منظر میں یہ شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ مذکورہ بالا شعر میں سورج اسلام سے عبارت ہے اور سیاہ شام باطل کا استعارہ اور ''فصیلِ شب'' نظامِ جبر کی علامت بن گئی ہے۔ شعر کی زیریں تہوں میں ایک سیدھے سادے انسان کی بے بسی، بے قراری کا احساس بھی پنہاں ہے جو اُس کے کربناک تاثر کو بہت گہرا کردیتا ہے۔

شکیلؔ نے نئی اور پرانی دونوں شاعری کے اثرات قبول کئے ہیں۔ لیکن لفظوں کے استعمال اور طرز اظہار میں وہ کسی خصوصی رویّے کو نہیں اپناتے۔ وہ ایک ایک عام انسان کی طرح اپنے آس پاس کی بکھری ہوئی زندگی کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہیں اور ایک دردمند دل رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اُس کی شاعری میں ذاتی المیوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی دکھوں کا احساس غالب نظر آتا ہے۔

عذابِ آگہی سنجیدہ کردیتا ہے فطرت کو!　　　شعور آتے ہی بچّے مسکرانا چھوڑ دیتے ہیں

لگتا ہے کہ دیوانوں کو راس آگیا زنداں　　　مدت سے کھڑکتی نہیں زنجیر کسی کی!

جو اصل سے کٹتے ہیں کہیں کے نہیں رہتے　　　بکھری ہوئی خوشبو کا ٹھکانہ نہیں ہوتا

مذکورہ بالا اشعار میں کیسی تڑپ ہے۔ کیسے زندہ اور پائندہ لفظ لکھّے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے تئیں بدلتے ہوئے عالمی اور ملکی صورتِ حال کے تناظر میں، جذبات واحساسات کی کتنی کامیاب ترجمانی کی گئی ہے۔ ہر شعر میں معنی کا ایک جہاں آباد ہے جو قاری کو اپنے باطن میں اترنے پر اصرار

کرتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر صرف اپنی ذات میں گُم نہیں ہے بلکہ اپنے عہد اور اپنے اطراف سے بھی باخبر ہے اور وہ اپنے گرد وپیش میں ہونے والی تبدیلیوں کا شعور رکھتا ہے۔ یہ اشعار ہمارے سماج اور معاشرے سے اُس کی گہری وابستگی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

شکیلؔ کی شاعری کا سرچشمہ ہماری جیتی جاگتی زندگی ہی سے پھوٹتا ہے۔ اُس کی شاعری میں صداقت کی جو آواز ہے، اندر کی گھٹن کا جو احساس ہے، معاشرتی ناہمواریوں اور فرد کے منافقانہ رویوں کا شکوہ ہے وہ قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول ہی نہیں کراتا بلکہ اُس پر غور وفکر نئے افق وآفاق کو روشن بھی کرتا ہے۔

ناروا ہو گیا، ناسزا ہو گیا　　　　سب بھلے ہو گئے، میں بُرا ہو گیا

فرد کی بے حسی کا نوحہ:

اس سے پہلے جو کبھی ہوتا نہ تھا، ہونے لگا　　　　عقل حیراں ہے کہ اس دنیا کو کیا ہونے لگا

شاعر زمین سے اپنے رشتے کی حقیقت کو جانتا ہے:

دکھ تو اِس کا ہے کہ رشتوں کا بھرم ٹوٹ گیا　　　　زخم کا کیا ہے میاں زخم تو بھر جائے گا

بے عملی اور ذوقِ تن آسانی پر دو حرف:

دنیا جسے کہتے ہیں میاں جائے عمل ہے　　　　باتوں سے کہیں بنتی ہے تقدیر کسی کی

غیرت مند ضمیر کی آواز:

لو یں تم اپنے چراغوں کی اپنے پاس رکھو　　　　ہم اپنے ساتھ کئی آفتاب رکھتے ہیں

معاشرے کے زوال کا ایک رُخ:

سب کر رہے ہیں تنگیٔ حالات کا گلہ　　　　اپنی ضرورتوں کو گھٹاتا نہیں کوئی

معاشرتی ناہمواریوں اور فرد کی بے بسی کا آئینہ:

بھاتی ہے ہمیں بھی در و دیوار کی خوشبو　　　　کچھ خواب کما لیں گے تو گھر جائیں گے ہم بھی

نفی کا ایک رُخ یہ بھی ہے:

واقعیٔ اشک ندامت رائیگاں جاتا نہیں　　　　دھیرے دھیرے صاف دل کا آئینہ ہونے لگا

نازک جذبوں کی پاکیزگی اور جنون کی شائستگی کا یہ معیار:　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

جان دے کربھی رہے اُس کی نظر میں معتوب ہم تو سمجھے تھے کہ احسان اُتر جائے گا

شاعر کا دل نہ صرف زندہ ہے بلکہ وہ دوسروں کے دلوں کی تڑپ کو بھی سمجھتا ہے۔ یہ اشعار اُس کے نکھرے ہوئے احساس جمال کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کیا خبر تھی کہ وہ روتے ہوئے جانے والا خواب بن کر میری آنکھوں میں ٹھہر جائے گا

مدعی دل کا ویسے بھی کوئی نہ تھا آپ نے کہہ دیا، آپ کا ہو گیا

ہے پیشِ نظر شوخئی تحریر کسی کی کاغذ پہ اُتر آئی ہے تصویر کسی کی

گھٹا، بہار، دھنک، چاندنی، صبا، شبنم نشاطِ جاں! تجھے کسی نام سے پکاروں میں

شکیل بہت سادگی اور روانی کے ساتھ اپنی وارداتِ قلبی کو غزل میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ حقائق کے ادراک شدّتِ احساس اور لہجے کا بانکپن، اُس کے شعور و وجدان اور فکر و احساس کے تربیت یافتہ ہونے کا غمّاز ہے۔ اُس نے محاسن شعری کے اُن آداب کا بھی لحاظ رکھا ہے جو الفاظ کو سلیقے سے برتنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ زبان و بیان کا حسن اُس کی رمزیت و اشاریت، اُس کی لطافت و شگفتگی روانی اور بے ساختگی سے کچھ ایسی فضا پیدا ہوتی ہے کہ جس کی سحر انگیزی سے قاری کا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ شکیل کے اشعار صرف لطف و مسرّت ہی نہیں عطا کرتے بلکہ قدم قدم پر غور و فکر کے ''جہان تازہ'' کا در بھی وا کرتے جاتے ہیں جب ہم اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ روشنی کا نقیب ہے۔ ہر نوع کے ظلم کے خلاف مزاحمت کا داعی ہے۔ سبز رُت کی بازیافت اس کی ویران آنکھوں کا روشن خواب ہے وہ خوددار اور غیرت مند ہے حسّاس ایسا کہ اگر بستی بزدل سالاروں سے خوش ہو تو اُسے یہ فکر کہ اب شاید جانبازوں کی تشکیل نہ ہو سکے گی۔ وہ دیوانگیٔ شوق کا خوگر، اقدام پر اصرار کرنے والا، تن آسانی اور مصلحتِ وقت کو معیار بنانے کے چلن کا مخالف ہے۔ اُس کی خواہش ہے کہ معاشرے میں روشنی پھیلے تاکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تب و تاب، تباہ ہوتی ہوئی انسانیت کی زندگی کی ضامن بن جائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ ''دامنِ درد'' کو گلزار بنا لینے والے شاعر کے ''دلِ پرخوں کے ہنر'' کو ہم دیکھیں، سمجھیں اور اِس سے خلوص کے ساتھ استفادہ کریں۔

نشّہ رنگ سے ہے واشُدِ گُل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں۔

شبیر ہاشمی، مالیگاؤں

پیش لفظ

ڈاکٹر محبوب راہیؔ

مہاراشٹر میں ممبئی کے بعد مالیگاؤں، ناگپور، اکولہ اور دھولیہ شعروادب کے مراکز بن کر اُبھرے۔ دھولیہ میں اکرمؔ دھولیوی، حنیفؔ دھولیوی، زاہدؔ دھولیوی، اطہرؔ دھولیوی، سراج انصاری جیسے کاملین فن اساتذہ نے اپنی اعلیٰ وارفع تخلیقی صلاحیتوں سے شہر کے ادبی وقار واعتبار کو مستحکم اور رفعت نشاں کیا۔ ایک تو دھولیہ کا خوشگوار اور زرخیز ادبی ماحول سونے پر سہاگہ کے مصداق ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا نمونہ وہ علمی وادبی خاندان جس میں شکیلؔ ابن شرفؔ نے جنم لیا جس میں ابوشحمہ ظفرؔ، غلام رسول اطہرؔ، سراج احمد سراجؔ، ابواحمد وحشیؔ اور شکیل کے والد ماجد یحییٰ شرفؔ جیسے ارباب قلم اور اکابرین شعروسخن کی شمولیت ہے۔ اس گھر اور شہر کا ادبی ماحول شکیلؔ ابن شرفؔ کی خداداد شعری صلاحیتوں کو مزید نکھارنے اور جلا بخشنے میں معاون ثابت ہوا۔ پھر سونے پر سہاگہ اطہرؔ حنفی، حنیف دھولیوی اور زاہدؔ دھولیوی جیسے کامل فن اساتذہ کی رہنمائی دیکھتے ہی دیکھتے شکیل ابن شرفؔ نے اپنے منفرد تخلیق پاروں کے وسیلے سے نہ صرف شہر کے اطراف واکناف میں بلکہ ادبی دنیا میں دُور دُور تک اپنی پہچان کے نقوش اجاگر کر لیے اور اب وہ اپنے منتشر شیرازۂ سخن کو یکجا کر کے یقین واعتماد کے ساتھ ''خوشبو کا بدن'' کے نام سے مجموعے کی شکل میں اہل ذوق اور ارباب نقد وبصیرت کے سامنے پیش کر رہے ہیں شکیل ابن شرفؔ کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دلی جذبات، محرکات اور خیالات، اپنے اندرون اور بیرون، اپنے گردوپیش کے حالات، روزمرّہ کے واقعات، درپیش معاملات اور معمولات نیز اپنے نجی تجربات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے پر دسترس رکھتے ہیں اُن کے اشعار، زندگی کی دھڑکنوں سے گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں زندگی کی حرارت، اپنی مٹّی کی خوشبو مہکتی ہے اُن کی شاعری میں زندگی کے روزمرّہ مسائل کی ترجمانی ہے جن سے شب وروز قدم قدم پر جوجھنا پڑتا ہے۔ اُن کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سب کر رہے ہیں تنگیِ حالات کا گلہ　　　اپنی ضرورتوں کو گھٹاتا نہیں کوئی

خوش ہوں کہ پوری ہوگئیں گھر کی ضرورتیں		دُکھ ہے کہ تیرے کان کے بالے نہیں رہے
عمریں کٹ جاتی ہیں دوست بنانے میں		دُشمن تو با آسانی ہوجاتے ہیں
مُفلس نہیں ہوتی تو جلائی نہیں جاتی		عیب اِس کے علاوہ کوئی دُلہن میں نہیں تھا
کسی غریب کا کب احترام کرتی ہے		لباس دیکھ کے دُنیا سلام کرتی ہے
تیرگی کی شکایت تو کرتے ہیں سب		کوئی اپنے دیئے کو جلاتا نہیں

اِن اشعار میں قناعت پسندی، غربت وافلاس، دوستی دُشمنی اور نور وظلمت جیسے مسائل سے راست مکالمہ ہے۔ زندگی اور اُس کے مسائل کا شکیل ابن شرف نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اِن سرد وگرم مسائل سے اپنے آپ کو گذارا ہے۔ اُنہیں اپنے جسم وجاں پر جھیلا ہے۔ لہٰذا اُن کے اشعار میں رہگذرِ حیات کے تمام نشیب وفراز کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ جانتے ہیں دُنیا کارگہہِ عمل ہے۔ یہاں محض باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ محض خوفِ خدا ہے جو انسان کو بُرائی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ندامت کے آنسوؤں سے آئینہ دِل صاف ہوجاتا ہے۔ اُنہیں پتہ ہے کہ ہوا کسی کا چراغ جلنے نہیں دیتی۔ آگہی اِک عذاب ہے جو بچپن چھین لیتی ہے۔ رابطوں کی استواری کے لئے کسی نہ کسی وصف کا ہونا ضروری ہے۔ نئی تہذیب کے آوارہ گرد بیٹوں کی مائیں رات رات بھر ان کا راستہ تکتی ہیں۔ لفظ خلوص بے معنی ہوکر رہ گیا ہے۔ اچھائی کی ترسیل کے لئے ذہن کا روشن ہونا ضروری ہے۔ گھر بچے کا مکتب ہوتا ہے۔ اِن اشعار میں شکیل ابن شرف کے تجربات ملاحظہ کیجئے۔

دُنیا جسے کہتے ہیں میاں جائے عمل ہے		باتوں سے کہیں بنتی ہے تقدیر کسی کی
خدا کو خوف ہے جو روک لیتا ہے بُرائی سے		بظاہر آدمی پر کوئی پہرہ بھی نہیں ہوتا
واقعی اشک ندامت رائیگاں جاتا نہیں		دھیرے دھیرے صاف دِل کا آئینہ ہونے لگا
وہ سر پھری ہے میاں آشنا کسی کی نہیں		چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی
تعلق کے لئے کچھ وصف کا ہونا ضروری ہے		پرندے بے ثمر پیڑوں پہ آنا چھوڑ دیتے ہیں
بوڑھی آنکھیں تھک جاتی ہیں رستہ تکتے تکتے		بیٹا آوارہ گردی کرتا ہے رات گئے تک
روشن جب تک ذہنوں کی قندیل نہ ہوگی		اچھی باتوں کی ہرگز ترسیل نہ ہوگی
گھر بھی مکتب ہوتا ہے یہ دھیان رہے		بچے ہر ہر بات تمہاری سیکھیں گے

پتھر آتے ہیں پھل دار درختوں پر   اچھے لوگوں کو ہی ستایا جاتا ہے

شکیلؔ ابن شرفؔ کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر نیا شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں ہمارے اردو کے بیشتر شعراء محض موزونی طبع کے بل بوتے پر ردائف وقوافی کے سہارے متعینہ بحور کے سانچوں میں گھسے پٹے الفاظ، پٹی پٹائی تراکیب ڈال کر شعر گڑھ لیتے ہیں اور دوسرے کے چبے چبائے نوالوں کی جُگالی کر کے بُزعم خود صاحب کمال بن جاتے ہیں انھیں نہ تو اپنے کلاسیکی ورثے کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی اپنے عہد کے تخلیقی تقاضوں اور ادبی ضرورتوں ہی سے باخبر ہوتے ہیں لیکن شکیلؔ ابن شرفؔ کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہ نئی بات، نئے انداز، نئے تیور، نئے لب ولہجہ، نئے رنگ وآہنگ سب کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں پرانا کیا ہے،؟ کس انداز؟ کس لہجے؟ کس رنگ وآہنگ میں کہا گیا ہے؟ نیز انھیں درک ہے کہ موجودہ حالات ان سے کیا تقاضہ کرتے ہیں۔ نیز موجودہ ادبی ضروریات کے کیا مطالبے ہیں لہٰذا وہ کہتے ہیں۔

جب بھی اسے دہراؤ پھڑکتی ہے طبیعت   جو شعر ہو سچا وہ پرانا نہیں ہوتا

کلاسیکی گہر پاروں کی تب وتاب سے درخشاں ان کے ایسے ہی اچھے اور سچّے شعر جو پرانے ہونے کے باوجود بالکل نئے ہیں اور جنھیں بار بار دہرانے سے طبیعت پھڑک اٹھتی ہے ملاحظہ کیجئے۔

آیا پیری میں عبادت کا خیال   ہائے کب زادِ سفر یاد آیا

وقت معشوق نہیں ہے کہ منالو گے اسے   روٹھ جائے گا تو پھر لوٹ کے آنے کا نہیں

خود کو روک لو اس گلی میں جانے سے   باز آ، آبرو گنوانے سے

اندر سے یہ زمین معطّر ہے کس قدر   کھلتا ہے جو بھی پھول مہکتا ضرور ہے

زندگی اور دشوار ہو جائے گی   مشکلوں کا اگر خاتمہ ہو گیا

اس سے پہلے جو کبھی ہوتا نہ تھا ہونے لگا   عقل حیراں ہے کہ اس دنیا کو کیا ہونے لگا

کیسے کیسے نو بہ نو پہلو برآمد کر کے نئی اور جدید تر معنویت عطا کی ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ نے کلاسیکی اثاثے کے اِن لازوال شعروں کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے جس سے طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ دراصل شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری کو کسی ایک حصار میں محصور کرنا مشکل ہے۔ اِس پر

روایت، ترقی پسندی جدیدیت یا مابعد جدیدیت جیسے کسی نظریے، رُجحان یا تحریک کا لیبل چسپاں کرنا اُس کی Originality اصلیت کے ساتھ بے انصافی کے مترادف ہوگا۔ سچائی یہ ہے کہ اُن کے اشعار میں موقع ومحل اور موضوع کی مناسبت سے کہیں تو کلاسیکی رنگ جھلکتا ہے، کہیں ترقی پسند لہجے کی گھن گرج سُنائی دیتی ہے تو کہیں جدید علامات، لفظیات، تشبیہات واشارات کی جلوہ گری سے وہ جدیدیت سے معمور دکھائی دیتے ہیں۔ شکیلؔ ابن شرفؔ نے اپنے تخلیقی رویّے کو کسی ایک رنگ میں محصور ہونے سے بہر صورت محفوظ رکھا ہے کہ غزل کی فطری شناخت اس کی متقاضی ہے۔ اُن کے درج ذیل سدابہار اشعار ملاحظہ کیجئے۔

گھٹا، بہار، دھنک، چاندنی، صبا، شبنم — نشاطِ جاں، تجھے کس نام سے پُکاروں میں
تھا میرا وجود اِک نئی مہکار کی زد میں — وہ مُجھ پہ جھکا شاخِ صنوبر کی طرح تھا
جلتی راتیں تنہائی اور اُس کی یاد — ساون اب کے خون رُلانے آیا تھا
چاند کا بھی عکس دیکھا جھیل میں — خوب تھا لیکن ترے جیسا نہ تھا
چاندنی اُس کے گرد پھرتی تھی — اُس کا چہرہ گلاب جیسا تھا
عہد جوانی نام ہے وحشت خیزی کا — جذبے خود ہی طوفانی ہو جاتے ہیں
کیوں اُس کی زُلف بانہوں پہ آئے نہ بار بار — صندل کی سمت سانپ لپکتا ضرور ہے

رویتی یا کلاسیکی غزل کے حسن کی دلکشی اور عشق کی سرمستی سے معمور گرمئی جذبات سے مہکتے دہکتے ان اشعار میں اُن لازوال اور شوخ وشنگ رنگوں کی جگمگاہٹ ہے جنہیں ایوانِ غزل کی سجاوٹ اور آرائش میں اضافے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ اِن میں گھٹا، بہار، دھنک، چاندنی صبا، شبنم، نشاطِ جاں، شاخ صنوبر، جلتی راتیں، ساون، چاند، جھیل، گلاب، عہدِ جوانی، وحشت خیزی زلف، باہیں، صندل، سانپ یہ تمام استعاراتی تلازمے تشبیہات کا لافانی ذخیرہ اردو غزل کی جاذبیّت اور پائیداری کا روزِ اوّل تا حال ضامن رہا ہے۔ گھٹا، بہار، دھنک، چاندنی، صبا، شبنم جیسے خوبصورت ناموں سے نشاطِ جاں کو پکارنا کسی کے شاخِ صنوبر کے جھکنے سے وجود کا نئی مہکار کی زد میں آنا۔ ساون میں تنہائی کی جلتی راتوں میں اُس کی یاد کا خون رُلانا، چاند کے عکس کا معشوق سے کمتر نظر آنا، چاندنی کا گلاب جیسے چہرے کے گرد پھرنا، عہد جوانی کی وحشت خیزی میں جذبوں کا طوفانی ہو جانا اور زلفوں

کو بانہوں پر دیکھ کر سانپ کے صندل سے لپٹنے کا تصور، کیسی کیسی نئی نویلی ترکیبیں ہیں۔ کیسا انوکھا تخیل ہے، کیسی اچھوتی سوچ ہے جس کا اظہار متذکرہ بالا اشعار میں کیا گیا ہے۔ روایتی غزل کے یہ موضوعات یہ صدا بہار اور لافانی مضامین جنہیں فیشن پرست جدیدیوں نے روایت کی تہمت قرار دے کر انہیں مملکتِ غزل سے ملک بدر کر رکھا تھا۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کی غزل نے اپنی تمام تر دلکشی، شگفتگی، شائستگی، شستگی، تازگی اور جدّت و ندرت کے ساتھ قاری کو ایک نئے چٹخارے دار ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔ سادگی، سلاست، تازہ کاری اور اثر آفرینی، جو غزل کو محبوبیت عطا کرتے ہیں شکیلؔ ابن شرفؔ کی غزل میں یہ اوصاف بار بار جھلکتے محسوس ہوتے ہیں۔ ویسے شکیلؔ ابن شرفؔ نے بھی اپنے عہد کے کردار پر لبیک کہتے ہوئے جدیدیت کو اپنایا ضرور ہے لیکن جدّت پسندی کی دھُن میں گنجلک تراکیب، بعید از فہم پیچیدہ علامات دور از کار تشبیہات غیر مانوس استعارات اور لایعنی لفظیات کے گورکھ دھندے سے اپنے جدید اشعار کو مبہم اور مہمل بنانے کی بجائے انہیں نئی معنویت سے آراستہ کیا ہے۔ جدید رنگ و آہنگ میں رچے بسے عصری حسّیت اور سماجی معنویت سے معمور اُنکے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

عذابِ آگہی سنجیدہ کر دیتا ہے فطرت کو
شعور آتے ہی بچے مسکرانا چھوڑ دیتے ہیں

آنکھیں بھی گنوا دو گے اُجالوں کی ہوس میں
سورج سے اُلجھنے کی جسارت نہیں کرنا

سب اپنی اپنی شباہت تلاش کرتے رہے
کھُلا کہ شکل پسِ آئینہ کسی کی نہیں

سوچا تو بہت دور تلک میں نظر آیا
دیکھا تو مرا عکس بھی درپن میں نہیں تھا

تم ہم کو بے دخل کرو گے آخر کس کس بستی سے
ہوش میں آؤ نادانو ہم دُنیا بھر میں رہتے ہیں

شکیلؔ ابن شرفؔ کے اِن خوبصورت اشعار کو پیش کرتے ہوئے ان کی روشنی میں پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اِس مجموعے کے مقبولِ خاص و عام ہونے نیز اِس کے وسیلے سے شکیلؔ ابن شرفؔ کے تابناک ادبی مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہوں اور دُعا بھی۔۔۔

ڈاکٹر محبوب راہیؔ

سابق پرنسپل جی این اے کالج، بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ، ۴۴۴۴۰۱

ترجمانِ حقیقت شکیلؔ ابن شرفؔ

شکیلؔ ابن شرفؔ کے ادبی شعور نے اُس دور میں آنکھ کھولی جب ادب کی ترقّی پسند تحریک ہرنوجوان دِل اور ذہن کو مسحور کیے ہوئے تھی۔ جب شاعری اُن مقاصد کی ترجمان تھی جن کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام سے روندی ہوئی زندگی کو ایک مہذب اور خوشگوار سماج میں تبدیل کرنا تھا۔ شکیلؔ ابن شرفؔ کا کلام بظاہر کسی تحریک سے متاثر نظر نہیں آتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شکیلؔ ابن شرفؔ کا کلام 'شبِ تاریک' میں ایک کرن کی مانند ہے، جو ذہن وروح کو متاثر کرتی ہے۔ اِن کے اشعار جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں اور اپنے گردوپیش میں وہ جو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُسے الفاظ کا مکمّل روپ دیتے ہیں۔ جو پُر اثر بھی ہے اور خوش رنگ بھی۔ اِس سے شکیلؔ ابن شرفؔ کی فطری اور اکتسابی صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اِن کی شاعری نے حالیہ مکاتبِ فکر سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا۔ عہد حاضر کے موضوعات ہوں یا عام زندگی کی عکاسی اِن کی نگاہ ہر مقام پر حقیقت کی متلاشی نظر آتی ہے۔ وہ کسی عالم میں ہوں شعر کی غنائیت سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ ان کے کُچھ اشعار جو مُجھے بے حد پسند آئے وہ میں درج کر رہا ہوں۔

یہ بات سچ ہے کہ مارا ہے دُشمنوں نے مجھے — مگر سوال یہ ہے میں تِری امان میں تھا

انکساری سے سرخمیدہ رہے — ورنہ اونچے درخت تھے ہم بھی

پہنچے جو گھر تو ساری تھکن دور ہوگئی — جو کچھ کما کے لائے تھے بچوں میں رکھ دیئے

آنکھیں بھی گنوا دوگے اُجالوں کی ہوس میں — سورج سے اُلجھنے کی جسارت نہیں کرنا

میرے عکس پہ پتھر مار کے کیا پاؤ گے — پانی میں صورت مری تحلیل نہ ہوگی

پیٹ پر باندھ لیا ہے پتھر — جب کبھی لقمۂ تر یاد آیا

میں شکیلؔ ابن شرفؔ کے مجموعہ کلام کا خیر مقدم کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ اہل نظر اِس کلام کو پسند کریں گے۔

ایڈوکیٹ یٰسین مومن، بھیونڈی

۲۵ فروری ۲۰۰۴ء

خوشبو کا بدن

حق پرستی،رواداری،دوستی اور محبت کا پیغام

شاعری جو دِل سے کی جائے وہ سچّی شاعری ہوتی ہے۔عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ردیف قافیہ بھی درست نہیں اور بڑے بڑے شاعروں کی فہرست میں نام شمار ہونے لگتا ہے۔ایسے اشعار میں جذبات کی عکاسی کہاں سے ہوگی۔مگر کبھی کبھی کچھ شعراء کا کلام دِل کو چھو جاتا ہے یا یوں کہئے کہ دِل کی آواز بن کر گونجنے لگتا ہے اور اُس کی بازگشت دِل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔یوں تو شکیل ابن شرفؔ سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی فون پر بات ہوئی۔مگر جب فیروز انصاری کا خط مِلا اور ساتھ میں کلام بھی تو میں نے سوچا فیروز انصاری سے بات کروں۔

فیروز انصاری نے شکیل ابن شرفؔ کے بارے میں بتایا میں نے خط کے ساتھ منسلک اشعار کو پہلے تو سرسری طور پر پڑھا مگر اِس کے بعد میں نے اِس کلام کو بغور پڑھا کچھ اشعار تو بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی سچے ہیں۔

شکیل ابن شرفؔ کی شاعری پر باتیں کرنے سے پہلے اُن کے حالاتِ زندگی پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔کیوں کہ حالاتِ زندگی ہی اِس بات کا ثبوت ہیں کہ شاعر کے کلام میں جو تجربات ہیں وہ اُس نے زندگی کی رہگذر پر چلتے ہوئے زندگی کے نشیب وفراز سے کس طرح حاصل کیے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ حالاتِ زندگی ہی کسی بھی شاعر کے کلام کا آئینہ ہوتے ہیں کیوں کہ وہ جن حالات سے دوچار ہوتا ہے وہی احساس اُس کی شاعری کا وصف بن جاتا ہے اور یہی جذبہ اُس کی شاعری کو ممتاز کرتا ہے۔اُس کے لب ولہجے کو نیا رنگ دیتا ہے۔

شکیلؔ کی محبت،وضع داری،اخلاق اور شفقت کی ہی وجہ ہے کہ دھولیہ میں ایک انجمن محبّانِ شکیلؔ کے نام سے قائم ہے جو اردو زبان وادب کی خدمات انجام دے رہی ہے۔شکیلؔ اپنی خودداری کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

مجھے یہ ضد کہ نہ دامن کبھی پساروں میں   وہ چاہتا ہے کہ اپنی انا کو ماروں میں

یہ حقیقت ہے کہ خوددار لوگ دُنیا میں کبھی دامن نہیں پھیلاتے اور جو لوگ خوشامد پسند ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ خودداروں کی خودداری ختم ہوجائے۔تاکہ وہ ان کی شان میں قصیدے

پڑھیں یا اپنا عرض مدّ عا خود بیان کریں۔آج کتنے لوگ ہیں جو اپنی خودداری کی بوسیدہ ردا اوڑھے ہوئے ہیں ورنہ لوگ ایک معمولی سا سوراخ بھی برداشت نہیں کر پاتے اور اَنا کی چادر لپیٹ لیتے ہیں ایک مفلس باپ کا درد دیکھئے ؎

اپنے آپ سے شرمندہ ہوں ٹوٹ گیا معصوم کا دل　　　ناحق میں اپنے بچّے کو ساتھ لیے بازار گیا

ایک مُفلس کی مُفلسی کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

خوش ہوں کہ پوری ہوگئیں گھر کی ضرورتیں　　　دُکھ ہے کہ تیرے کان کے بالے نہیں

پیاسی موجیں چاٹ رہی تھیں اُس کے پاؤں　　　وہ ساحل پہ پیاس بُجھانے آیا تھا

زندگی کے کرب کو کس قدر سادگی سے بیان کیا ہے کہ ساحل اور پیاس کا ذکر تو اکثر اشعار میں مل جاتا ہے مگر پیاسی موجیں واقعی بہت خوبصورت انداز بیان ہے اِس طرح سے ایک شخص جو خود پیاسا ہے پیاسی موجیں اس کے سامنے اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے۔اس شعر میں شکیل ابن شرؔف کہتے ہیں۔

اب کہاں وہ محفلیں وہ رونقیں وہ چاہتیں　　　تو نہیں تو سارا منظر بے صدا ہونے لگا

وہیں شکیل ابن شرؔف دُنیا کے بےحِس پتھر دِل لوگوں کو غیرت دِلانے کے لئے کہتے ہیں

لگتا ہے کہ دیوانوں کو راس آ گیا زنداں　　　مُدت سے کھڑکتی نہیں زنجیر کسی کی

حقیقت ہے کہ شاعر وہی ہے جس کی شاعری دِل کی آواز ہو یعنی ہر سننے والے کو اپنے حالاتِ زندگی اس آئینے میں دِکھائی دیں۔یہ بھی سچ ہے کہ صداقت کی بات ہر کسی کو اچھی نہیں لگتی اور اس کو ہمیشہ دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس لئے شکیل ابن شرؔف نے کہا ہے۔

تم ہم کو بےدخل کرو گے آخر کس کس بستی سے　　　ہوش میں آؤ نادانو ہم دُنیا بھر میں رہتے ہیں

میں شکیل ابن شرؔف کو اس شعری مجموعے کی تکمیل پر مبارک باد پیش کرتی ہوں اور خدا سے دُعا کرتی ہوں کہ اُن کا قلم حق پرستی،دوستی،رواداری اور محبت کے پیغام عام کرتا رہے۔جس کی اس وقت انسانیت کو بہت سخت ضرورت ہے اور میں ان کا یہ شعر ان کی نظر کرتے ہوئے خدا سے دعا کرتی ہوں کہ ان کی سوچ کو کبھی حالات کا گرہن نہ لگے۔کیونکہ

جب بگڑتا ہے وقت کا تیور　　　بات بنتی نہیں بنانے سے

شہلا نواب ایڈیٹر ماہنامہ ’محفلِ صنم‘،دہلی۔

تیری رفعت رفعت ہے ، تیری عظمت عظمت ہے
تیرے آگے دَم مارے ، کِس میں اِتنی جرأت ہے

بے عِلّت بے عیب ہے تو ، ہاں علاّم الغیب ہے تو
سب سے جُدا لاریب ہے تو، تیری وحدت وحدت ہے

تو ہی بادِ بہاری میں ، موسم کی گُلکاری میں
جنگل میں پھلواری میں ، ہر سو تیری نکہت ہے

ڈھالا ہر انسان الگ ، ہے سب کی پہچان الگ
دی ہے سب کو شان الگ ، تیری صنعت صنعت ہے

کوئی نہیں ہے تیرے سوا، بخش دے تو مجھ کو میرے خدا
میں ہوں سراپا جُرم و خطا ، تو رحمت ہی رحمت ہے

منظر منظر میں ہے تو ، تیرا جلوہ ہے ہر سو
تیرے ذکر میں ہے خوشبو ، تیری یاد میں لذّت ہے

میں تو شکیلؔ اس فکر میں ہوں ، کیا اس کی تعریف کروں
سر کو جھکائے بیٹھا ہوں ، دِل پر طاری ہیبت ہے

جوازِ افتخارِ خاک دے دے
خدایا دولتِ ادراک دے دے

عطا کر جُبّہ و دستار سب کو
مِرے حصّے میں اِک مسواک دے دے

نہ دے مال و منال و جاہ و حشمت
مدینہ کے خس وخاشاک دے دے

رہے دِل میں ہمیشہ تیری ہیبت
علاجِ گردشِ افلاک دے دے

نہیں ہے دولتِ دُنیا سے مطلب
فقط حُبِّ شہِ لولاکؐ دے دے

عطا کر دے مِری پہچان مجھ کو
شعورِ فطرت بے باک دے دے

نہیں انسان کی تحصیل میں کچھ
مگر جو کچھ خُدائے پاک دے دے

منتظر تھا ایک مدّت سے زمانہ آپؐ کا
خیر مقدم کیوں نہ ہوتا والہانہ آپؐ کا

چاند تارے کر رہے ہیں مدح خوانی آپؐ کی
لالہ وگل کی زبان پر ہے ترانہ آپؐ کا

نور کے سانچے میں ڈھل کر نور پھیلانے لگیں
جب پڑا تاریکیوں پر تازیانہ آپؐ کا

چاند پر پڑتی ہے آقاؐ جب کبھی میری نظر
یاد آتا ہے مجھے اُنگلی اُٹھانا آپؐ کا

تب سے پھولوں کو تقدس کا لبادہ مل گیا
جب سے دیکھا گلستاں نے مسکرانا آپؐ کا

فیض پایا ہے سبھی نے آپؐ کی تعلیم سے
کیوں نہ گرویدہ رہے سارا زمانہ آپؐ کا

روضۂ اقدس پہ آکر کیوں نہ ٹھہریں قافلے
باعثِ تسکینِ دل ہے آستانہ آپؐ کا

آپؐ کے گھر سے چلا ہے اِنکساری کا چلن
سب سے اعلیٰ سب سے افضل ہے گھرانہ آپؐ کا

اپنے بندوں پر ہے کِتنا مہرباں ربّ کریم
اِک ثبوت اس کا ہے رحمت بن کے آنا آپؐ کا

دیکھتا رہتا ہے حسرت سے زمیں کو آسماں
منبعِ انوارِ رحمت ہے ٹھکانہ آپؐ کا

حکمرانی آپؐ نے کی بوریئے پر بیٹھ کر
خوب تھا انداز آقاؐ خسروانہ آپؐ کا

ہے شکیلؔ ابن شرف کے دل میں بس یہ آرزو
حشر میں دنیا کہے اُس کو دِوانہ آپؐ کا

سنا ہے جان لیکر دوست پیچھا چھوڑ دیتے ہیں
اگر یوں چھوڑ دیتے ہیں تو سستا چھوڑ دیتے ہیں

عذابِ آگہی سنجیدہ کر دیتا ہے فطرت کو!
شعور آتے ہی بچّے مسکرانا چھوڑ دیتے ہیں

یہ دوشیزہ اجل کی کون سا انداز رکھتی ہے
کہ سب اپنے عزیزوں کو بلکتا چھوڑ دیتے ہیں

کچھ ایسے وصف بھی ہیں جو زباں پر لا نہیں سکتے!
تعارف دوستوں کا ہم ادھورا چھوڑ دیتے ہیں

عمل سے ہم کو جھٹلا نا ہے بد خواہوں کا یہ دعویٰ
جو بن جاتے ہیں شاعرِ کام دھندا چھوڑ دیتے ہیں

ہم اپنے سر کبھی تقلید کی تہمت نہیں لیتے!
جو رستہ عام ہوتا ہے وہ رستہ چھوڑ دیتے ہیں

تمہیں اپنی روش پر اِک نہ اِک دن سوچنا ہوگا
نہیں وہ ہم جو آسانی سے پیچھا چھوڑ دیتے ہیں

تعلق کے لئے کچھ وصف کا ہونا ضروری ہے
پرندے بے ثمر پیڑوں پہ آنا چھوڑ دیتے ہیں

ہمارے حوصلے حل ڈھونڈ لیتے ہیں مسائل کا
وہ ہوں گے اور جو گھبرا کے دنیا چھوڑ دیتے ہیں

شکیلؔ اِس پر بھی اتراتے ہوئے دیکھا ہے لوگوں کو
جو مضموں ہم سمجھ کر عامیانہ چھوڑ دیتے ہیں

تنہائی سے لپٹے ہوئے منظر کی طرح تھا
ویرانے کا نقشہ بھی مِرے گھر کی طرح تھا

ڈوبا تھا لہو میں مرے احساس کا پیکر
لہجہ مرے احباب کا خنجر کی طرح تھا

کچھ دائرے پانی پہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے
میں جھیل میں پھینکے ہوئے پتّھر کی طرح تھا

تھا میرا وجود اِک نئی مہکار کی زد میں
وہ مجھ پہ جھکا شاخِ صنوبر کی طرح تھا

اِک بوند بھی پایا نہ شکیلؔ اہلِ طلب نے
وہ شخص بظاہر تو سمندر کی طرح تھا

بھورے بادل جب پانی ہو جاتے ہیں
جنگل کے جنگل دھانی ہو جاتے ہیں

عمریں کٹ جاتی ہیں دوست بنانے میں
دشمن تو باآسانی ہو جاتے ہیں

فطرت کھیلوں میں بھی رنگ دکھاتی ہے
کچھ بچے راجا رانی ہو جاتے ہیں

عہدِ جوانی نام ہے وحشت خیزی کا
جذبے خود ہی طوفانی ہو جاتے ہیں

جب کوئی دشمن کے عیب گِناتا ہے
شرم سے ہم پانی پانی ہو جاتے ہیں

ذِکر جب ان کا محفل میں چھڑ جاتا ہے
سب کے چہرے نورانی ہو جاتے ہیں

صدیاں ان کو دُہراتی رہتی ہیں شکیلؔ
اچھے نغمے لافانی ہو جاتے ہیں

وہ اُس پہ خفا ہے جو مِرے من میں نہیں تھا
پتّھر وہ لگا اُس کو جو گوپھن میں نہیں تھا

مُفلس نہیں ہوتی تو جلائی نہیں جاتی
عیب اس کے علاوہ کوئی دلہن میں نہیں تھا

سوچا تو بہت دور تلک میں نظر آ یا!
دیکھا تو مِرا عکس بھی درپن میں نہیں تھا

اس بار بھی یاروں نے کیا پشت پر حملہ
اس بار مگر میں کوئی الجھن میں نہیں تھا

نیزے پہ مِرے سر کو اُٹھائے ہوئے پھرتا
اتنا تو سلیقہ مِرے دشمن میں نہیں تھا

کہوں کیا تہمتِ دیدہ وری قسمت میں لکھّی تھی
بساطِ شب کی آئینہ گری قسمت میں لکھّی تھی

نہ ہوتے تم تو کوئی اور منظر ہوش اُڑا دیتا
جو سچ پوچھو تو یہ جامہ دری قسمت میں لکھّی تھی

مرے احباب میرے نام کی شمعیں جلاتے ہیں!
شکایت کیا کروں پس منظری قسمت میں لکھّی تھی

اگر ہم چاہتے تو دونوں عالم دسترس میں تھے
بہ ایں خود اختیاری چاکری قسمت میں لکھّی تھی

فضا کی وسعتیں آواز دیتی رہ گئیں مجھ کو!
میں کیا کرتا کہ بے بال و پری قسمت میں لکھّی تھی

نجومی نے بتایا تھا کہ بے فکری کے دن ہونگے
کھلا آخر کہ دریوزہ گری قسمت میں لکھّی تھی

شکیلؔ آئینۂ احساس کا انجام کیا کہئیے
بُتانِ سنگ دل کی دِل بَری قسمت میں لکھّی تھی

کس دِن ہماری جان کے لالے نہیں رہے
کب اژدہے زبان نکالے نہیں رہے

خوش ہوں کہ پوری ہو گئیں گھر کی ضرورتیں
دُکھ ہے کہ تیرے کان کے بالے نہیں رہے

ڈیرا جما چکی ہے ہر اِک گھر میں مُفلسی!
دروازوں کے نصیب میں تالے نہیں رہے

کس وقت آیا حرفِ شکایت زبان پر
کب ہم تِری رضا کے حوالے نہیں رہے

ناقدریِٔ ہُنر کا گلہ کیا کہ ہم شکیلؔ
اپنا وقار آپ سنبھالے نہیں رہے

اُس کا کمرہ بھی روشن دیکھا ہے رات گئے تک
میرے جیسا کیا وہ بھی رویا ہے رات گئے تک

اُترا اُترا سا اُس کا چہرہ تھا سب کہتے ہیں
مجھ سے بچھڑ کر شاید وہ جاگا ہے رات گئے تک

پلکوں کی چوکھٹ پر رُک جاتی ہے نیند کی دیوی
میری آنکھوں میں کوئی رہتا ہے رات گئے تک

کل کا سورج جانے کیسا موسم لے کر آئے
دِل اندیشوں میں ڈوبا رہتا ہے رات گئے تک

بوڑھی آنکھیں تھک جاتی ہیں رستہ تکتے تکتے
بیٹا آوارہ گردی کرتا ہے رات گئے تک

تب جا کر دو وقت کی روٹی اُس کو مِل پاتی ہے
جینے کی خاطر کوئی مرتا ہے رات گئے تک

یار شکیلؔ احمد جیسوں کا پوچھ نہ ٹھور ٹھکانہ
سڑکوں پر اکثر پھرتے دیکھا ہے رات گئے تک

نذر ہم نے اپنی شمعوں کا اُجالا کردیا
اے زمینِ شعر جا تجھ کو ہمالا کردیا

میں اندھیروں کی شکایت کر رہا تھا اِس لئے
میرے گھر کو پھونک کر اس نے اُجالا کردیا

ہیں گلی کوچوں میں کس کی بربریّت کے نشاں
کِس نے یہ تہذیب کے چہرے کو کالا کردیا

پُشت پر بھی ہر گھڑی رہتی ہے اب میری نظر
میں تھا اندھا دوستوں نے آنکھ والا کردیا

دل بتوں کی یاد سے آباد رکھتے ہو شکیلؔ
تم نے تو اللہ کے گھر کو شِوالا کردیا

مِٹے ہیں جیسے ہم اِک شخص کی خوشی کے لئے
مٹا نہ ہوگا کوئی اس طرح کسی کے لئے!

کبھی کسی کے بھروسے پہ جنگ مت کرنا
کوئی کسی سے اُلجھتا نہیں کسی کے لئے

وہ فیض اُٹھاتا رہا میری سادہ لوحی کا
فریب کھاتا رہا میں خود آگہی کے لئے

گُلوں کا کِھل کے بکھرنا تو امر لازم ہے
دعائیں مانگ دِلوں کی شگفتگی کے لئے

یہ اور بات پتنگوں کو خاک ہونا پڑا
چراغ ہم نے جلائے تھے روشنی کے لئے

پھر اس کے بعد تمہارا سُراغ کھو بیٹھا
ٹھہر گیا تھا میں رستے میں دو گھڑی کے لئے

اُلجھ گئے ہیں خود اپنے ہی مسئلوں میں شکیلؔ
چُنے گئے تھے ہم اوروں کی رہبری کے لئے

بے نیازِ فکرِ ہست و بود ہو جا ئیں گے
سب فنا ہو ہو کے لا محدود ہوتے جا ئیں گے

سُرخرو ہوتے رہیں گے ہم خدا کے فضل سے
لوگ جل جل کر حِصارِ دوُر ہوتے جا ئیں گے

دوستوں پر کُھلتی جا ئیں گی ہماری خو بیاں
دشمنوں کے حاشیئے بے سود ہوتے جا ئیں گے

بچپنے کی حد سے جب نکلے تو یہ ہم پر کھلا !
جتنا بڑھتے جا ئیں گے محدود ہوتے جا ئیں گے

تا قیا مت بس یوں ہی چلتا رہے گا سلسلہ
لوگ آتے جا ئیں گے نابود ہوتے جا ئیں گے!

فیض پہنچاتے رہیں گے اہلِ دل ہر حال میں
گر جلائے بھی گئے تو عوُد ہوتے جا ئیں گے

دوستوں کی قدر افزائی سے لگتا ہے شکیلؔ
وقت حاسد اور ہم محسود ہوتے جا ئیں گے

ہمدردی کا سوانگ رچایا جاتا ہے
پہلے مارا پھر سہلا یا جاتا ہے

ہانڈی میں پتّھر بھی پکایا جاتا ہے
بچوں کو یوں بھی بہلایا جاتا ہے

ہر شب سپنے ٹوٹ کر بکھرا کرتے ہیں
روز سنہرا خواب دکھایا جاتا ہے

یاروں کو بھی خوش کرنا لازم ہے میاں
دانستہ بھی دھوکا کھایا جاتا ہے

خوش فہمی کے خول میں سمٹے بیٹھے ہیں
تاویلوں سے دل بہلایا جاتا ہے

اپنے چہرے کے دھبّوں کا دھیان نہیں
آئینہ اوروں کو دکھایا جاتا ہے

وہ میرے گھر آئے تو کیا قہر ہوا
ہمسائے کے گھر ہمسا یا جاتا ہے

قربانی کا طالب ہوتا ہے ہر شوق
کچھ کھونے کے بعد ہی پایا جاتا ہے

پتھر آتے ہیں پھل دار درختوں پر
اچھے لوگوں کو ہی ستایا جاتا ہے

آنکھیں ہیں بینائی سے محروم شکیلؔ
سورج پر الزام لگایا جاتا ہے

ہم ایسوں کو مت اپنی پہچان میں رکھ
تو بھی رُسوا ہو جائے گا دھیان میں رکھ

باطل تجھ سے ٹکرا کر مِٹ جائے گا
اِتنا پختہ پن اپنے ایمان میں رکھ

یہ کیا جانیں موسم کی رنگینی کو!
کاغذ کے پھولوں کو مت گلدان میں رکھ

کھینچ رہی ہے گاؤں کی مٹّی اپنی اور
چل پھر اپنی خوشبو کو کھلیان میں رکھ

میرے ہر اِک لفظ میں ہے تقدیسِ وفا!
میری تحریریں دِل کے جُزدان میں رکھ

تو کیا تھا کیا ہے ظاہر ہو جائے گا
اپنے حال کو ماضی کی میزان میں رکھ

دولت سے ہر چیز نہیں حاصل ہوتی
اپنی محرومی کو بھی اِمکان میں رکھ

اپنا داؤں چھپائے رکھ میرے بھائی
تھوڑی دیر تو دشمن کو پہچان میں رکھ

چونک اٹھے قاری جس کو پڑھتے ہی شکیلؔ
ایک نیا پن اپنے ہر عنوان میں رکھ

خواہشِ عزّت و کلاہ نہ کر
فن کو آلودۂ گناہ نہ کر

کم سے کم اپنی آبرو تو سنبھال
ہم سے تو چاہے تو نباہ نہ کر

کہیں تکرار سے بھی مسئلہ حل ہونے والا ہے
نہ اِسکے منہ پہ تالا ہے نہ اُس کے منہ پہ تالا ہے

یہ کب معلوم تھا الزام مجھ پر آنے والا ہے
کہ میری چُپ کا اس نے اور ہی مطلب نکالا ہے

یہ میرا فرض بنتا ہے کہ اس کے ہاتھ دُھلواؤں
سنا ہے اس نے میری ذات پر کیچڑ اُچھالا ہے

نہیں معلوم میرا ذکر کِس انداز سے آئے!
محبت کے تعلق سے وہ کچھ فرمانے والا ہے

انانیت نے تنہا کر دیا مجھ کو زمانے میں
نہ کوئی ہم نوالا ہے نہ کوئی ہم پیالا ہے

مخالف مجھ سے ٹکرا کر بالآخر لوٹ جائینگے
ہوائیں پھر ہوائیں ہیں ہمالا پھر ہمالا ہے

شکیلؔ آخر گلے میں پھنس گئے ہم اپنے دشمن کے
ہماری سادگی سے وہ یہ سمجھا تر نوالا ہے

آخری دم زندگی بن کر صدا دے دوں گا میں
ڈوبنے والے کو تھوڑا حوصلہ دے دوں گا میں

چند بوندیں ہیں لہو کی اب بھی میرے دِل کے پاس
غم نہ کر تیری ہتھیلی کو حِنا دے دوں گا میں

اپنے ہاتھوں سے کھرچ ڈالوں گا اپنے نام کو!
خود کو تجھ سے دور رہنے کی سزا دے دوں گا میں

سب کے چہرے پر مِرا چہرہ نظر آئے گا کل!!!
عکس اپنا آئینہ درآئینہ دے دوں گا میں

پھر مِرا جی چاہتا ہے اُس کے بارے میں لکھوں
پھر نیا لہجہ غزل کو دیکھنا دے دوں گا میں

کس لئے احباب تعریفیں مِری کرنے لگے!
کون سی دولت ہے میرے پاس کیا دے دوں گا میں

دوستوں کو اپنا گرویدہ بنالوں گا شکیلؔ!
دشمنوں کو پھر انا کا مسئلہ دے دوں گا میں

بھی خواہوں کا منصوبہ مکمل ہو گیا ہوتا
جو میں بہرا نہیں ہوتا تو پاگل ہو گیا ہوتا

بھلا ہو دشمنوں کا جو مجھے سرگرم رکھتے ہیں
نہ ہوتے یہ تو میں گذرا ہوا کل ہو گیا ہوتا

انا نے دوٗر رکھّا دوستی کے فیض سے اُس کو
گلے مل لیتا وہ بڑھکر تو صندل ہو گیا ہوتا

سنبھالا زندگی بھر اے غزل تیرے تقدّس کو
نہ ہوتے ہم تو میلا تیرا آنچل ہو گیا ہوتا

شکیلؔ احساس کی دولت اگر مجھکو نہیں ملتی
میں اپنی ذات میں کب کا مقفّل ہو گیا ہوتا

شکایتوں سے کر حذر دِلوں کو مت غُبار دے
روِش وہ اِختیار کر جو نفرتوں کو مار دے

میں منتظر ہوں اے خدا تری عطائے خاص کا
وہ درد مجھ کو کر عطا جو زندگی سنوار دے

کتابِ حق میں جا بجا لکھا ہوا ہے برملا !
اُسے کوئی دبائے کیا خدا جِسے اُبھار دے

میں روبہ انحطاط ہوں اسیرِ احتیاط ہوں
بہت ہی بے بساط ہوں جوازِ اِفتخار دے

تو میرا اعتبار کر نہیں ہے مجھ کو کچھ خبر
لگا ہوا ہوں داؤں پر وہ جیت دے کہ ہار دے

نمائشیں ہیں بے اثر کہ بولتا ہے خود ہُنر
ہزار اہتمام کر ہزار اشتہار دے

بڑا گناہ گار ہے شکیلؔ شرمسار ہے
یہ تجھ کو اختیار ہے بگاڑ دے سنوار دے

کاش ہوتا شہر کا ماحول گاؤں کی طرح
یوں نہ ہم آوارہ پھرتے بے نواؤں کی طرح

دھیرے دھیرے کھُل رہی ہے دوستوں کی دوستی
داؤں پر ہم لگ چکے ہیں باوفاؤں کی طرح

میں چراغِ راہ کی مانند کیا روشن ہُوا
لوگ چِلّانے لگے کالی بلاؤں کی طرح

میرے پائے استقامت میں نہ جنبش آ سکی
وقت ٹکراتا رہا پاگل ہواؤں کی طرح

کھردرے ہوتے نہ یوں معصوم چہروں کے نقوش
مائیں پیش آتیں اگر بچوں سے ماؤں کی طرح

زندگی بھر اس سے چھٹکارا نہ مِل پایا ہمیں
خواہشیں لپٹی رہیں دِل سے بلاؤں کی طرح

اتفاقاً بچ کے جو طوفاں سے واپس آ گئے
بات وہ کرنے لگے ہیں ناخداؤں کی طرح

وقت کیا بدلا کہ دنیا ہی بدل کر رہ گئی
آشنا ملنے لگے ناآشناؤں کی طرح

آدمی پر منحصر ہے اس نے کیا حاصل کیا
وقت تو اُڑتا ہی جاتا ہے ہواؤں کی طرح

سادگی میں لوگ پھر دھوکہ نہ کھاجائیں کہیں
سانپ باتیں کر رہے ہیں فاختاؤں کی طرح

زندگی دشوار ہوتی جارہی ہے دن بہ دن
زہر بھی بکنے لگا ہے اب دَواؤں کی طرح

بے ثمر کہہ کر گھنے پیڑوں پہ مت آری چلا
دھوپ سہہ کر چھاؤں دیتے ہیں یہ ماؤں کی طرح

وقت کے ہمراہ چلنا سیکھ لو ورنہ شکیلؔ
رکھ دیئے جاؤ گے بوسیدہ قباؤں کی طرح

دن کو مہینہ اور مہینے کو سال کر
سب رکھ دیا ہے وقت نے کس بل نکال کر

تنہائیوں کے بیچ نہ خود کو نڈھال کر
آ دوستوں میں بیٹھ طبیعت بحال کر

کیا غیب سے ظہور میں آتا ہے دیکھئے
بیٹھا ہوں نیکیوں کو میں دریا میں ڈال کر

دیکھے جو اپنے ہاتھ تو شرمندہ ہو گئے
خوش ہو رہے تھے مجھ پہ جو کیچڑ اچھال کر

شاہانِ کرّوفر کے شکستہ مزار دیکھ
پھر اس کے بعد خواہشِ جاہ وجلال کر

گاڑی میں بیٹھ کر میں اسے دیکھتا رہا
رُخصت ہُوا فِضا میں وہ بوسہ اُچھال کر

جو لوگ کر رہے ہیں تعاقب مِرا ہنوز
بیٹھے ہوئے ملیں گے زبانیں نکال کر

بچّوں کی سر زنش میں ضروری ہے احتیاط
کڑوی دوائیں دیتے ہیں میٹھے میں ڈال کر

غصّہ شعور و عقل کا دشمن ازل سے ہے
بھولے سے بھی قبول نہ تو اشتعال کر

آپس میں لڑتے رہتے ہیں گاندھی مزاج لوگ
ہو کیوں نہ کامیاب گرو گول وال کر

لفظوں کی بے بساطی پہ روئے گا تو شکیلؔ
اندھوں کی انجمن میں نہ شرحِ جمال کر

گئی رُتوں کو مِرا انتظار برسوں تھا
ہوا کے دوش پہ میں بھی سوار برسوں تھا

آئینہ مجھ کو دیکھ کے حیراں نہیں ہوا
اچھّا ہوا میں خود سے گُریزاں نہیں ہوا

اب کے برس بھی دوٗر نظر سے رہا وہ شخص
اب کے برس بھی جشنِ بہاراں نہیں ہوا

لگتا ہے انقلاب کا موسم نہ آئے گا
مُدّت سے کوئی داخلِ زنداں نہیں ہوا

سورج سیاہِ شام کے نرغے میں ہے شکیلؔ
یوٗنہی فصیلِ شب پہ چراغاں نہیں ہوا

چلتے ہوئے اِک روز ٹھہر جائیں گے ہم بھی
دریا ہیں سمندر میں اتر جائیں گے ہم بھی

اب بیٹھ کے زخموں سے لہو پونچھ رہا ہے
پہلے تو وہ سمجھا تھا کہ ڈر جائیں گے ہم بھی

یہ کیا کہ ہر الزام ہمارے ہی سر آئے
آئینہ بنو تم تو سنور جائیں گے ہم بھی

توڑیں گے نہیں اپنے قبیلے کی روایت
ہنستے ہوئے مقتل سے گزر جائیں گے ہم بھی

بھاتی ہے ہمیں بھی درو دیوار کی خوشبو
کچھ خواب کمالیں گے تو گھر جائیں گے ہم بھی

اخلاص کے رشتہ نے ہمیں باندھ رکھا ہے
دشمن یہ سمجھتا تھا بکھر جائیں گے ہم بھی

شرمندہ ہوا گھر میں وہ کچھ دیر لگا کر
سمجھا تھا صدا دے کے گزر جائیں گے ہم بھی

مجھے یہ ضد کہ نہ دامن کبھی پساروں میں
وہ چاہتا ہے کہ اپنی انا کو ماروں میں

خدا کرے کہ وہیں ڈوب جائے میرا وجود!
اگر کسی کو مدد کے لئے پکاروں میں

اندھیری رات، ہوائیں خلاف، ساحل دوُر
تری رضا ہو تو پھر ہاتھ پاؤں ماروں میں

گھٹا، بہار، دھنک، چاندنی، صبا، شبنم
نِشاطِ جاں تجھے کس نام سے پکاروں میں

شکست و فتح تو قسمت کی بات ہے اے ماں
دعا یہ دے کہ کبھی حوصلہ نہ ہاروں میں

خدائے عِلم اگر مجھ کو استطاعت دے
ہر ایک دِل میں نئی روشنی اُتاروں میں

شکیلؔ جِن کے لئے لڑ رہا ہوں دُنیا سے
عجب نہیں کہ اُنہی دوستوں سے ہاروں میں

صحرا کو گلزار بنانے آیا تھا
دیوانہ تھا وقت گنوانے آیا تھا

اور نیا اِک زخم لگا کر لوٹ گیا
دِلداری کرنے کے بہانے آیا تھا

پیاسی موجیں چاٹ رہی تھیں اُسکے پاؤں
وہ ساحل پر پیاس بجھانے آیا تھا

دیکھ کے میرے گھاؤ ہوا شرمندہ وہ
مجھ کو اپنی چوٹ دکھانے آیا تھا

جلتی راتیں، تنہائی اور اس کی یاد
ساون اب کے خون رُلانے آیا تھا

پانی مجھ کو دیکھ کے کیوں اِٹھلاتا ہے
جھیل پہ آخر کون نہانے آیا تھا

○

وارثِ تاج و تخت تھے ہم بھی
صاحبِ ساز و رخت تھے ہم بھی

آج رُسوائے دہر ہیں لیکن
کل تلک نیک بخت تھے ہم بھی

انکساری سے سرخمیدہ رہے
ورنہ اونچے درخت تھے ہم بھی

اُس نے بھی کروٹوں میں کاٹی رات
صبح تک لخت لخت تھے ہم بھی

وہ بھی برہم تھا لفظ لفظ شکیلؔ
لہجہ لہجہ کرخت تھے ہم بھی

جب مِرے قد کے برابر ہو گئے
میرے بچے مُجھ سے باہر ہو گئے

جس طرف گذرا ہے وہ صندل بدن
دیکھنے والے معطّر ہو گئے

اُڑ گئی جو اس کے آنے کی خبر
راستے سارے منوّر ہو گئے

نفرتوں نے جو لگائے تھے کبھی
آج وہ پودے تناور ہو گئے

ذکر تو میری وفا کوشی کا تھا
آپ کیوں آپے سے باہر ہو گئے

پُشت سے آواز آئی تھی شکیلؔ
مُڑ کے دیکھا اور پتّھر ہو گئے

کُشتۂ جبرو ستم بانکے سجیلے ہو گئے
اِک انا کی نذر کتنے ہی قبیلے ہو گئے

اپنے قد کو جو سمجھتے تھے ہمالا کی طرح
جب ہمارے سامنے آئے تو ٹیلے ہوگئے

شہر کے ماحول میں یہ زہر کس نے بھر دیا
دیکھتے ہی دیکھتے منظر نکیلے ہو گئے

اس سے پہلے کم نہیں تھی گر چہ لہجے کی مٹھاس
مُجھ سے مِل کر اور اس کے لب رسیلے ہو گئے

نامُرادی رنگ لا کر ہی رہی آخر شکیلؔ
میرا چہرہ اور اس کے ہاتھ پیلے ہو گئے

ماں کی آغوش میں سمٹے ہوئے بچّوں کی طرح
زندگی ہم نے گزاری ہے فرشتوں کی طرح

حرف آنے نہ دیا اپنے عزیزوں پہ کبھی
حال ہم اپنا سُناتے رہے قصّوں کی طرح

دِل کے جُزدان میں محفوظ کیئے جا اِن کو
روشنی ہے مِرے شعروں میں صحیفوں کی طرح

حق بیانی سے مفادات نے روکا ہردم !
ہاں میں ہاں ہم بھی ملاتے رہے لوگوں کی طرح

اُس کی آنکھوں میں بھی ویرانی جھلکتی دیکھی
میرے اندر بھی تھا سنّاٹا خلاؤں کی طرح

ہم تو رسماً پئے تعظیم اُٹھے تھے صاحب
آپ پیش آنے لگے ہم سے خداؤں کی طرح

اسلیئے سب کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں شکیلؔ
ہم نے دامن نہیں پھیلائے تھے اوروں کی طرح

میرے اندر کا جو سنّاٹا بکھر جائے گا !
شہر کو دیکھ کے وِیرانا بھی ڈر جائے گا

جان دیکر بھی رہے اس کی نظر میں معتوب
ہم تو سمجھے تھے کہ احسان اُتر جائے گا

دکھ تو اس کا ہے کہ رِشتوں کا بھرم ٹوٹ گیا
زخم کا کیا ہے میاں زخم تو بھر جائے گا

ہو گیا ہے وہ مِرے قُرب کا عادی اتنا !
اب اگر دوٗر گیا مجھ سے تو مر جائے گا

کیا خبر تھی کہ وہ روتے ہوئے جانے والا
خواب بن کر مِری آنکھوں میں ٹھہر جائے گا

زاویہ اپنی نگاہوں کا بدلیئے ورنہ
میرے اندر جو فرشتہ ہے وہ مرجائے گا

اس سے کہہ دو کہ جوانی پہ نہ اِترائے شکیلؔ
یہ تو چڑھتا ہوا دریا ہے اُتر جائے گا

وہ سر پھری ہے میاں آشنا کسی کی نہیں
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کِسی کی نہیں

ہمارا حال جو ہے بس خدا ہی جانتا ہے
ہمارے ساتھ عزیزو دُعا کسی کی نہیں

سب اپنے اپنے عمل کا حساب دیتے ہیں
کبھی کسی کے سَر آتی بَلا کسی کی نہیں

سب اپنی اپنی شباہت تلاش کرتے رہے
کھُلا کہ شکل پسِ آئینہ کسی کی نہیں

خود اپنی سادہ مزاجی نے ہم کو مارا ہے
یہ بات سچ ہے عزیزو خطا کسی کی نہیں

بہت دنوں سے وہی ایک ہُو کا عالم ہے
شکیلؔ خانۂ دِل میں صدا کسی کی نہیں

بھولے سے بھی لبوں کو کبھی وا نہیں کیا
اپنی طلب کو ہم نے تماشا نہیں کیا

کِس روز اُس کے در پہ نہ دھونی رمائے ہم
کِس روز اُس نے وعدۂ فردا نہیں کیا

مانگی دعائے ہجر تو مقبول ہو گئی !
اب کے اثر دُعا نے بھی اُلٹا نہیں کیا

اِک روز سب کے سامنے آئے گا دیکھنا
کیا کیا کِیا ہے آپ نے کیا کیا نہیں کِیا

کِس طرح دِل میں ڈالتا شیطان وسوسہ
ہم کو تمہاری یاد نے تنہا نہیں کیا

یہ سچ ہے کوئی اپنا بھرم کھولتا نہیں
اُس نے کسی سے ذکر ہمارا نہیں کیا

انصاف تو گواہوں کا محتاج ہے شکیلؔ
دیکھے گا کون جُرم کیا ، یا نہیں کیا

بات ضد کی ہے سوال آئینہ خانے کا نہیں
تم بلاؤ گے بھی مجھ کو تو میں آنے کا نہیں

قرض کی شکل میں ہر سانس ادا ہوتی ہے
زندگی ہے یہ کوئی خواب دِوانے کا نہیں

وقت کے جبر سے محفوظ نہ رہ پاؤ گے
حوصلہ تم میں اگر ضرب لگانے کا نہیں

لوٹنے والے مجھے، تو بھی پشیماں ہوگا
گھر کا تخمینہ ہے نقشہ یہ خزانے کا نہیں

وقت معشوق نہیں ہے کہ منا لوگے اُسے!
روٹھ جائے گا تو پھر لوٹ کے آنے کا نہیں

گھر پہ آئے ہوئے مہمان سے منہ پھیرتے ہو
یہ طریقہ تو شریفوں کے گھرانے کا نہیں

ان ہواؤں کی اعانت بھی ضروری ہے شکیلؔ
مسئلہ صرف چراغوں کو جلانے کا نہیں

کس حال میں ہے وہ یہ بتاتا نہیں کوئی
اس کی گلی سے لوٹ کے آتا نہیں کوئی

پھر کیوں بلا رہے ہو جب آتا نہیں کوئی
یوں اپنی آبرو تو گنواتا نہیں کوئی

پلکوں پہ موتیوں کو سجاتا نہیں کوئی
مدّت ہوئی کہ یاد بھی آتا نہیں کوئی

سب کر رہے ہیں تنگیِ حالات کا گِلہ!
اپنی ضرورتوں کو گھٹاتا نہیں کوئی

کالی گھٹا ہو، بادِ صبا ہو کہ شاخ گل
تیرے بغیر وجد میں آتا نہیں کوئی

ایسا نہیں کہ اب وہ جیالے نہیں رہے
احساس سو گیا ہے جگاتا نہیں کوئی

لگتا ہے ہو گئے ہیں حقیقت پسند لوگ
اپنائیت کا ڈھونگ رچاتا نہیں کوئی

تہذیبِ عشق تیرا زمانہ گزر گیا
اب اپنے سر پہ خاک اُڑاتا نہیں کوئی

اپنی صلیب آپ اٹھائے پھرو شکیلؔ
اب دوسروں کا ہاتھ بٹاتا نہیں کوئی

احباب کے دِلاسوں پہ نازاں نہ ہو شکیلؔ
لفظوں سے اب خلوص کا ناتا نہیں کوئی

○

حسن کی بھیک کہیں مانگنے آتا نہ ہو چاند
آسماں کیوں نظر آتا ہے تری چھت سے مِلا

قصّۂ نفع و ضرر یاد آیا
پھر عزیزوں کا ہنر یاد آیا

پیٹ پر باندھ لیا ہے پتّھر
جب کبھی لقمۂ تر یاد آیا

آیا پیری میں عبادت کا خیال
ہائے کب زادِ سفر یاد آیا

جب کبھی اُسکو بھلانا چاہا
وہ بہ اندازِ دِگر یاد آیا

دیکھ کر دست حِنائی اُن کا
خونِ دل ، خونِ جگر یاد آیا

نہیں آسان زمینِ غالب
تھا ہمیں زعمِ ہنر یاد آیا

کوئی ملتا تھا گلے ہم سے شکیلؔ
دیکھ کر شانے کو سر یاد آیا

اُٹھ بادبان کھول دے لنگر سمیٹ لے
ایسا نہ ہو کہ تجھ کو سمندر سمیٹ لے

نیلام ہو نہ جائے محبت کی آبرو !
اپنی بساط اے دلِ مضطر سمیٹ لے

جگنو ،گلاب ،چاند ،ستارے ،گھٹا ،دھنک
سب تیری دسترس میں ہیں بڑھ کر سمیٹ لے

کچھ بھی نہ ہاتھ آئے گا تذلیل کے سوا
توقیر چاہتا ہے تو چادر سمیٹ لے

ڈرتا رہا تو اینٹ دکھاتے رہیں گے لوگ
جینے کی آرزو ہے تو پتّھر سمیٹ لے

باہر کا شور زہر ہے تیرے لئے شکیلؔ
خود کو حصارِ ذات کے اندر سمیٹ لے

کب یہ گمان تھا کہ وہ مقتل بتائے گا
ہم تو سمجھ رہے تھے کوئی حَل بتائے گا

آندھی کی زد میں آ کے لچکنا ہے لازمی
گِر جائے گا وہ پیڑ جو کس بل بتائے گا

دستار میری چھین کے خوش ہو رہا ہے جو
اوقات اُس کی وقت اُسے کل بتائے گا

پیاسے فریب کھا کے گنوا دیں گے اپنی جان
صحرا سلگتی ریت کو جَل تھَل بتائے گا

بکھرے گی تیری زُلف گھٹا کے سوال پر
کیا چیز ہے دھنک ترا آنچل بتائے گا

بن بن کے سانپ اس سے لپٹتا رہوں گا میں
جب جب وہ اپنے آپ کو صندل بتائے گا

اس کا وقار خاک میں مل جائے گا شکیلؔ
جو کوئی اپنے آپ کو اوّل بتائے گا

بلا کا زور ہماری ذرا سی جان میں تھا
جو وقت ہم پہ پڑا تھا خود اِمتحان میں تھا

تلاشِ رزق کہوں یا عذابِ دربَدری
شکستہ پر تھا پرندہ مگر اُڑان میں تھا

میں چاہتا تھا کہ قِسمت سنوار دوں اُس کی
مگر وہ شخص تو کچھ اور ہی گمان میں تھا

یہ بات سچ ہے کہ مارا ہے دشمنوں نے مجھے
مگر سوال یہ ہے میں تِری اَمان میں تھا

وہ مجھ سے زیر ہوا بھی تو کیا تعجب ہے
مقابلہ ہی زمین اور آسمان میں تھا

بہت ہی پسَت تھا بازارِ وقت کا معیار
وہ مال بِک نہ سکا جو مِری دُکان میں تھا

شکیؔل کیوں نہیں آیا جواب آج تلک
جو خط لکھا تھا اسے تم نے کِس زبان میں تھا

○

جس کے رَد ہونے کا ڈر ہو وہ گذارش مت کرو
دوستوں کو مبتلائے آزمائش مت کرو

مل گیا نا دشمنوں کو موقعہ نشترزنی
میں نہ کہتا تھا کہ زخموں کی نمائش مت کرو

ہم نے یہ مانا کہ سب قسمت سے ملتا ہے مگر
اِس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کوشش مت کرو

حرفِ آخر وہ سمجھ بیٹھے نہ اپنے آپ کو
تم کِسی کم ظرف کی اتنی ستائش مت کرو

دیکھ کر چادر ہمیشہ پاؤں پھیلاؤ شکیلؔ
جو کبھی پوری نہ ہو پائے وہ خواہش مت کرو

تپتی زمین پیاس کا منظر نظر میں ہے
کوئی ہنوز دشتِ بلا کے سفر میں ہے

ہے میرے سر پہ دھوپ کی چادر تنی ہوئی
میرا وجود حلقۂ نامعتبر میں ہے

نیزے کی طرح آنکھوں میں چبھنے لگا ہوں میں
کیا خوب معجزہ مِرے دستِ ہنر میں ہے

نِکلے ہیں لوگ ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے
کیا آئینہ بَدست کوئی رہ گزر میں ہے

گھیرے ہوئے ہے شہر کو لشکر غنیم کا
عالم پناہ عافیت اب کے مفر میں ہے

میں بھی اَنا کے خول سے باہر نہ آسکا
وہ بھی حصارِ ذات کے اندر سفر میں ہے

دوشیزۂ بہار کی آمد نہ ہو شکیلؔ
خوشبو بتا رہی ہے کوئی رہ گزر میں ہے

ہم اپنے سنگریزوں کو مہ و اختر بنائیں گے
اندھیروں کے مقابل روشنی کے گھر بنائیں گے

جو نا قابل ہیں تربیت سے قابل ہو نہیں سکتے!
کہاں تک آپ آخر نقش پانی پر بنائیں گے

اُجالوں پر اندھیروں کا تسلّط ہو نہیں سکتا
وہ دیواریں اُٹھاتے جائیں گے ہم در بنائیں گے

مسائل بھی بلاؤں کی طرح آواز دیتے ہیں
پلٹ کر جو بھی دیکھے گا اُسے پتھر بنائیں گے

لپکتے ہیں میرے اندر جو یہ احساس کے شعلے
یقیناً دھیرے دھیرے مجھ کو خاکستر بنائیں گے

شکیلؔ آنے نہ دینگے آنچ ہرگز ان کے سائے تک
ہم اپنی ذات کو ہر رنج کا محور بنائیں گے

روشن جب تک ذہنوں کی قندیل نہ ہوگی
اچھّی باتوں کی ہرگز ترسیل نہ ہوگی

کیسی کیسی نازک باتیں پوشیدہ ہیں!
یار غزل جیسی کوئی زَنبیل نہ ہوگی

ساری بستی بُزدل سالاروں سے خوش ہے
شاید اب جانبازوں کی تشکیل نہ ہوگی

سنگ دِلوں سے پھولوں کی امّید نہ رکھنا
فِطرت فِطرت ہے ہرگز تبدیل نہ ہوگی

میرے عکس پہ پتّھر مار کے کیا پاؤ گے!
پانی میں صورت میری تحلیل نہ ہوگی

وقت بِگڑنے سے پہلے تو ہوش میں آجا
بھائی ورنہ کل کوئی تاویل نہ ہوگی

حیران اگر آئینہ خانہ نہیں ہوتا
بچنے کا مِرے کوئی بہانہ نہیں ہوتا

ایسا نہ ہو اِس میں ترے جلووں کی خطا ہو
بے وجہہ تو یوں کوئی دِوانہ نہیں ہوتا

کیا سارے مسائل سے تمھیں مل گئی فرصت
کیا بات ہے اب کیوں اِدھر آنا نہیں ہوتا

حق بات پہ مرمٹنے کا دعویٰ ہے سبھی کو
مقتل کی طرف کوئی روانہ نہیں ہوتا

جب بھی اسے دُہراؤ پھڑکتی ہے طبیعت
جو شعر ہو سچّا وہ پُرانا نہیں ہوتا

لگ جاتی ہیں یاروں کو بھی اکثر مِری باتیں
مخصوص مِرا کوئی نشانہ نہیں ہوتا

جو اصل سے کٹتے ہیں کہیں کے نہیں رہتے
بکھری ہوئی خوشبو کا ٹِھکانہ نہیں ہوتا

میری اَنا کو ضد ہے کبھی لَب نہ وا کروں
وہ شخص چاہتا ہے کہ میں التجا کروں

سَر گرداں مجھے رکھتی ہیں ہر دم ضرورتیں
بچّے یہ چاہتے ہیں میں گھر پر رہا کروں

گو مجھ سے مُنحرف ہے مگر میرا خون ہے
میں کیسے اُس کے حق میں کوئی بددُعا کروں

وہ مجھ کو سوچ سوچ کے بے کل رہا کرے
میں اُس کے دل میں درد کی صورت اُٹھا کروں

ساحل پہ ریت کے وہ گھر وندے نہیں رہے
بچپن کی یاد دل میں بَسائے پِھرا کروں

گزروں جدھر جدھر سے میں ٹھہروں جہاں جہاں
دیوار و در پہ نام تمہارا لِکھا کروں

اَحباب دِل کی بات سمجھتے نہیں شکیلؔ
ان پتھروں کے سامنے آئینہ کیا کروں

اس کا مِلنا بھی خواب جیسا تھا
وہ سمندر سراب جیسا تھا

چاندنی اُس کے گرد پھرتی تھی
اس کا چہرہ گلاب جیسا تھا

نہ دعائیں، نہ شفقتیں، نہ دُلار
میرا بچپن عذاب جیسا تھا

وہ بھکاری نظر نہیں آتا
جس کا لہجہ نواب جیسا تھا

اس کی فطرت تھی کرگسوں جیسی
وہ بظاہر عقاب جیسا تھا

کیا ٹھہرتی نظر کسی کی شکیلؔ
میرا چاند آفتاب جیسا تھا

جڑا ہوا ہے رحمتوں کا سلسلہ عذاب تک
جزا کا اہتمام ہے خطا کے ارتکاب تک

ہر ایک حرف معتبر ، ہر ایک لفظ باثر
کوئی کتاب کب پہنچ سکی تِری کتاب تک

خدا کرے کہ ختم بھی ہو نفرتوں کا سلسلہ
یہ زہر دھیرے دھیرے آ گیا ہے اب نِصاب تک

وہی قبول و ردّ کا مسئلہ ہے درمیان میں
کِسی کے اشتیاق سے کسی کے اجتناب تک

نزاکتوں کا تذکرہ چھڑا تو پھر رُکا نہیں
تِرے لبوں کی بات تھی چلی گئی گلاب تک

وہ دم بخود کھڑے رہے نظر اُٹھی نہ لب کھلے
عجیب کشمکش رہی سوال سے جواب تک

طلسم شب کو ٹوٹنا پڑے گا ہو کے سرنگوں
جلیں گے ہم چراغ بن کے صبحِ انقلاب تک

وہ روشنی پہ اپنا حق جتا رہے ہیں ان دنوں
سمٹ گئی تھی جن کی سوچ تیرگی کے باب تک

ضرورتوں کے سلسلے قدم قدم پہ ساتھ تھے
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک

ہمیں بھی تتلیوں کے پیچھے بھاگنے کا شوق تھا
ہمارے ساتھ بھی رہی ہیں علّتیں شباب تک

قیامتوں کا ہے سماں کہاں ملے گی اب اماں
سنا ہے دھوپ آگئی ہے خطّۂ گلاب تک

علومِ عصرِ نو کا ماحصل شکیلؔ کیا کہیں
سمندروں کی کھوج میں پہنچ گئے سراب تک

آوازِ اذاں سُن کے جو بیدار ہوا ہے
خوشنودیٔ یزداں کا سزاوار ہوا ہے

روتے ہیں اندھیروں کا جگر چیرنے والے
شبنم سے عجب کرب کا اظہار ہوا ہے

پیوندِ زمیں ہوگئے مزدور ہزاروں
اِک تاج محل تب کہیں تیار ہوا ہے

مفقود ہوئے جاتے ہیں سب اہل بصیرت
آئینہ بھی بے صَیقل و زنگار ہوا ہے

حالات کے بدلے ہوئے انداز نہ پوچھو!
یاروں کا تبسّم بھی دِل آزار ہوا ہے

بے ساختہ یاد آ گئے تیرے لب و رخسار
جب تذکرۂ کابُل و قندھار ہوا ہے

باپ کی شفقت ماں کی ممتا بُھول گیا
ہو کے بڑا وہ ہر اِک رشتہ بھول گیا

گھیر لیا تھا اس کو دولت مندوں نے
میرا بھائی مجھ سے ملنا بھول گیا

دکھیاری ماں آس لگائے بیٹھی ہے
شہر میں جا کر بیٹا رستہ بھول گیا

خط میں اس کو لکھ بھیجا سب دل کا حال
لیکن اپنا نام ہی لکھنا بھول گیا

گھر سے نکلتے وقت نہیں رُکتا میں بھی
وہ بھی دروازے تک آنا بھول گیا

مِری غزل مِرے اَفکار کی امانت تھی
مِرے وجود سے لپٹی ہوئی اَذیّت تھی

مِلی تو اُس پہ سبھی اپنا حق جتانے لگے
وہ روشنی جو ہماری رہینِ مِنّت تھی

پتنگے شمع پہ رقصاں، میں اس کے حُسن میں گم
کہیں طواف تھا جاری کہیں تِلاوت تھی

میں اس کو رَوند کے آگے نکل چکا ہوں بہت
وہ زندگی جو ترے نام سے عِبارت تھی

شَباب مجھ کو ضرورت کدے میں لے آیا
مِری نگاہ میں آسائشوں کی جنت تھی

کِرن کِرن کوئی خوشبو لٹا رہا تھا شکیلؔ
نظر نظر میں مہکتی ہوئی حرارت تھی

حُصولِ عظمتِ ماضی کا خواب رکھتے ہیں
کہاں ہم آج بھی اپنا جواب رکھتے ہیں

جو حق عزیز و اقارب کا داب رکھتے ہیں
وہی زمیں پہ بِنائے عذاب رکھتے ہیں

لَویں تم اپنے چراغوں کی اپنے پاس رکھو
ہم اپنے ساتھ کئی آفتاب رکھتے ہیں

میرے کریم ترِی رحمتوں کے صدقے میں
گناہ گار امیدِ ثواب رکھتے ہیں

خیال پُرسشِ اعمال کا نہیں ہے انھیں
جو زیرِ دستوں کو زیرِ عِتاب رکھتے ہیں

خیال یار ، غمِ روزگار ، فکرِ معاش
ہم ایک جان کو کتنے عذاب رکھتے ہیں

کب ان کے سامنے کام آئی اپنی لفّاظی
وہ ہر سوال کا سو سو جواب رکھتے ہیں

زمانہ کرتا ہے ان کی بہت پذیرائی
وہ حادثے جو مجھے ہم رکاب رکھتے ہیں

سبق جو لیتے ہیں نا کامیوں سے اوروں کی
شکیلؔ خود کو وہی کامیاب رکھتے ہیں

کسی غریب کا کب احترام کرتی ہے
لباس دیکھ کے دُنیا سلام کرتی ہے

ہوس کو دِل میں بسا کر نہ لو مصیبت مول
یہ چیز وہ ہے جو جینا حرام کرتی ہے

رَوشن ہے ہر اِک داغ اُجالوں کی طرف آ
گُزرے ہوئے لمحوں کے حَوالوں کی طرف آ

اسلاف کی تابندہ مِثالوں کی طرف آ
جینا ہے تو ہم جیسے جِیالوں کی طرف آ

ہو تجھ سے تو دنیا کو دے پیغامِ عمل پھر
تحریرِ مقدّس کے حوالوں کی طرف آ

ناکارہ بنا رکھاّ ہے ترمال نے تجھ کو
کچھ کر کے دِکھا خشک نوالوں کی طرف آ

کھو جائے کہیں گھر بھی نہ شہرت کی ہوس میں
ان پھوُل سے بچّوں کے سوالوں کی طرف آ

لوگوں پہ جو گذری ہے وہ سناّٹا کہے گا
دروازوں پہ لٹکے ہوئے تالوں کی طرف آ

آتی ہے شکیلؔ اب بھی صدا شہرِ طرب سے
آ لوٹ کے پھر چاہنے والوں کی طرف آ

رنگوں کی بے ثباتی سے انجان بھی نہ تھا
وہ تتلیاں پکڑ کے پشیمان بھی نہ تھا

دنیا سمجھ رہی تھی جِسے دیوتا سمان
پرکھا اس آدمی کو تو انسان بھی نہ تھا

اِک سایہ دار پیڑ کی صورت کھڑا ہے آج
وہ پودا جِس کا کوئی نگہبان بھی نہ تھا

پہنچا تو خوشبوؤں نے پذیرائی کی شکیل
دیکھا تو اس کے کمرے میں گُلدان بھی نہ تھا

پا کر زمیں پہ چاند کو چھکتا ضرور ہے
جو تجھ کو دیکھتا ہے ٹھٹکتا ضرور ہے

اندر سے یہ زمین معطّر ہے کس قدر
کِھلتا ہے جو بھی پھول مہکتا ضرور ہے

کیوں اسکی زلف آئے نہ بانہوں پہ بار بار
صندل کی سمت سانپ لپکتا ضرور ہے

رہتا ہے برقرار کہاں پردۂ حیا
ہاں پہلے پہلے کوئی جھجکتا ضرور ہے

یونہی طلسم تیرہ شبی ٹوٹتا نہیں
آنچل کہیں کسی کا ڈھلکتا ضرور ہے

شعروں میں ذکرِ غیر پہ نا حق خفا ہو تم
تنہا ئی میں خیال بھٹکتا ضرور ہے

جس کو عزیز ہوتی ہے اپنی سلامتی
وہ آدمی شکیلؔ لچکتا ضرور ہے

زباں پہ اس کی مسلسل بیان ہے میرا
مرا حریف تو خود ترجُمان ہے میرا

میں جانتا ہوں کہ یہ امتحان ہے میرا
نظر بچا کہ نہ جاؤ کہ دھیان ہے میرا

اسی لئے تو برستا ہے ٹوٹ کر پانی
اسے خبر ہے کہ کچّا مکان ہے میرا

فسادیوں نے اسے بھی جلا کے مار دیا
جو کہہ رہا تھا کہ بھارت مہان ہے میرا

میرے عروج کو صدیاں گزر گئیں لیکن
زمانہ آج بھی رَطبُ اللسان ہے میرا

اگر یہ ٹوٹ گیا بھی تو دکھ نہیں ہوگا
ترا یقین نہیں ہے گمان ہے میرا

ہزار بار بھی دُہراؤں تو نہ آئے گا فرق
تِرا بیان نہیں ہے بیان ہے میرا

اگر ہے رہنا تو اپنائیت کے ساتھ رہو
کوئی سرائے نہیں ہے مکان ہے میرا

مجھے یقین ہے وہ میرا بوجھ اُٹھالے گا
خُدا کے فضل سے بیٹا جوان ہے میرا

پتہ چلا کہ عزیزوں کی مصلحت تھی شکیلؔ
مجھے لگا تھا بڑا مان پان ہے میرا

○

پُرکھوں کی روایت سے بغاوت نہیں کرنا
ہرگز کسی ظالم کی حمایت نہیں کرنا

آنکھیں بھی گنوادو گے اُجالوں کی ہوس میں
سورج سے اُلجھنے کی جسارت نہیں کرنا

تو نہیں ہے تو بتا تیرے عِلاوہ کون ہے !!!
خواب بن کر میری راتوں میں مہکتا کون ہے

دیکھئے ایسا نہ ہو تنہا گذر جائے حیات
آپ جیسا چاہتے ہیں آج ویسا کون ہے

بات اگر سچ ہے تو اس کو بے جھجک کرلو قبول
تم عزیزو یہ نہ دیکھو کہنے والا کون ہے

یوں اکیلا چھوڑکر تم مجھ کو جاتے ہو کہاں
کیا کہوں گا لوگ جب پوچھیں گے تیرا کون ہے

جس گھڑی پہنچے عمرؓ بیت المقدس کے قریب
لوگ حیراں تھے کہ خادم کون آقا کون ہے

کیا ہوا کچھ لوگ اگر مجھ کو بُرا کہنے لگے!
جس کو سب اچھا کہیں دنیا میں ایسا کون ہے

کیوں کروں اسکی برائی خود کو کیوں اچھا کہوں
لوگ سب اچھی طرح واقف ہیں کیسا کون ہے

کس کے عیبوں کی نمائش ہو رہی ہے ہر طرف
پارسا لوگوں کی بستی میں یہ رُسوا کون ہے

مجھ کو شرمندہ وہ کر دیتا ہے یہ کہہ کر شکیلؔ
میرے جیسے تو بہت ہیں تیرے جیسا کون ہے

تم تو اپنی سادگی میں مست رہتے ہو شکیلؔ
تم کو کیا معلوم کیسا کون کیسا کون ہے

دھیرے دھیرے دُنیا داری سیکھیں گے
ہم بھی یارو تم سے یاری سیکھیں گے

گھر بھی مکتب ہوتا ہے یہ دھیان رہے
بچے ہر ہر بات تمہاری سیکھیں گے

رات دن لوہے سے ٹکراتا ہے وہ
تب کہیں دو وقت کی پاتا ہے وہ

جس کو سورج کہہ رہے ہیں یار لوگ
میرے سائے سے جِلا پاتا ہے وہ

تیرے آگے چاند کی اوقات کیا
کون سی خوبی پہ اِتراتا ہے وہ

نفرتیں بونے کی عادت ہے اُسے
قطرہ قطرہ زہر ٹپکاتا ہے وہ

جتنی شدّت سے بھُلاتا ہوں اُسے
اُتنی ہی شدّت سے یاد آتا ہے وہ

جس کے دل میں چور ہوتا ہے شکیلؔ
اپنے سائے سے بھی گھبراتا ہے وہ

اب سکوں ملتا نہیں یاروں کے بیچ
جی رہے ہیں ہم اداکاروں کے بیچ

چھوڑ دیں گے یہ دورنگی زندگی
جا کے بس جائیں گے بنجاروں کے بیچ

موسموں کا بھید چرواہوں سے پوچھ
آگ لگ جاتی ہے ملہاروں کے بیچ

بڑھ رہا ہے کیوں تباہی کی طرف
لوٹ جا اے آدمی غاروں کے بیچ

اُس نے پھر وعدہ کیا ہے شام کا
پھر کٹے گی رات انگاروں کے بیچ

ہم کو تنہائی کا غم کھاتا رہا !
چاندنی لُٹتی رہی تاروں کے بیچ

شہر کی سڑکوں پہ مت بھٹکو شکیلؔ
موت پھرتی ہے یہاں کاروں کے بیچ

اپنے مقصد سے ہٹ کر بے سمت سفر میں رہتے ہیں
وہ ناداں ہیں جو اوروں کی کھوج خبر میں رہتے ہیں

کون انھیں سمجھائے عمل کا ردّ عمل بھی ہوتا ہے!
مجھ پر پتّھر پھینکنے والے کانچ کے گھر میں رہتے ہیں

وہ میرے احباب کو مجھ سے برگشتہ کرتا ہے عبث
اس سے کہدو سیاّرے سورج کے اثر میں رہتے ہیں

تعریفوں کے پھول جھڑیں یا تنقیدوں کے تیر چلیں
کل بھی خبر میں رہتے تھے ہم اب بھی خبر میں رہتے ہیں

تم ہم کو بے دخل کرو گے آخر کس کِس بستی سے
ہوش میں آؤ نادانو ہم دنیا بھر میں رہتے ہیں

نیند کی دیوی گھبراتی ہے ہجر کی لمبی راتوں میں
آس کے پنچھی یاد کے جگنو دیدۂ تر میں رہتے ہیں

دیکھنے والی نظریں ہم کو دیکھ لیا کرتی ہیں شکیلؔ
ہم وہ پس منظر ہیں جو ہر اِک منظر میں رہتے ہیں

سرِ مژگاں اگر کوئی سِتارا بھی نہیں ہوتا
شبِ ہجراں تری خوشبو کا چرچا بھی نہیں ہوتا

تمہیں پانے کی دُھن میں سب سے کٹ کر رہ گیا ہوں میں
نہ ہوتے تم تو میں اتنا اکیلا بھی نہیں ہو تا

کھلونوں کے لئے بچّے تبھی اکثر مچلتے ہیں
ہماری جیب میں جب ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا

خدا کا خوف ہے جو روک لیتا ہے برائی سے
بظاہر آدمی پر کوئی پہرہ بھی نہیں ہوتا

وہاں اللہ کی قدرت دکھاتی ہے اثر اپنا
جہاں انسان کا کوئی وسیلہ بھی نہیں ہوتا

شکیلؔ اسلاف کے اوصاف جو پیشِ نظر رہتے
ہمارا دامنِ کردار میلا بھی نہیں ہوتا

ہے پیشِ نظر شوخئِ تحریر کسی کی
کاغذ پہ اُتر آئی ہے تصویر کسی کی

حاصل ہے فراغت تو نہ اِتراؤ زیادہ
رہتی ہے نہ رہ پائے گی جاگیر کسی کی

دنیا جسے کہتے ہیں میاں جائے عمل ہے
باتوں سے کہیں بنتی ہے تقدیر کسی کی

کم ظرف قیاس اپنے پہ کر لیتے ہیں خود ہی
ہم شعر میں کرتے نہیں تحقیر کسی کی

کس حال میں یارانِ عدم ہیں نہیں معلوم
آئی نہ خبر تا دمِ تحریر کسی کی

اس باب میں احباب کو حاصل ہے فضیلت
کب میری طرح ہوتی ہے تشہیر کسی کی

لگتا ہے کہ دیوانوں کو راس آ گیا زنداں
مدّت سے کھڑکتی نہیں زنجیر کسی کی

وہ میرؔ ہوں سوداؔ ہوں کہ ناسخؔ ہوں کہ غالبؔ
اقلیمِ سخن کب ہوئی جاگیر کسی کی

اتراتے ہیں وہ لوگ شکیلؔ اپنی چمک پر
جو مانگ کے لے آتے ہیں تنویر کسی کی

○

پہنچے جو گھر تو ساری تھکن دور ہو گئی
جو کچھ کما کے لائے تھے بچوں میں رکھ دیے

اس سے پہلے جو کبھی ہوتا نہ تھا ہونے لگا
عقل حیراں ہے کہ اس دنیا کو کیا ہونے لگا

اس کی کم ظرفی بالآخر سامنے آنے لگی
ہم تو عزت دے رہے تھے وہ خدا ہونے لگا

وقت سے بہتر نہیں ہے کوئی بھی آموزگار
دھوپ جب ڈھلنے لگی سایہ بڑا ہونے لگا

اب کہاں وہ محفلیں، وہ رونقیں، وہ چاہتیں
تو نہیں تو سارا منظر بے صدا ہونے لگا

جس کو کہتے ہیں محبت جان کا جنجال ہے
کس مصیبت میں تو اے دِل مبتلا ہونے لگا

واقعی اشکِ ندامت رائیگاں جاتا نہیں
دھیرے دھیرے صاف دِل کا آئینہ ہونے لگا

کب بُرے وقتوں میں کوئی ساتھ رہتا ہے شکیلؔ
دھوپ جب چڑھنے لگی سایہ خفا ہونے لگا

کوئی محوِ دیوار و در ہو نہ جائے
مِری بے کسی مشتہر ہو نہ جائے

نئی روشنی دردِسر ہو نہ جائے
قبیلہ مِرا منتشر ہو نہ جائے

تو مجھ سے تعلق کا اظہار مت کر
یہ دنیا کہیں تیرے سر ہو نہ جائے

وطن سے غلامی کا سمجھوتہ کر لے
کہ مٹی تیری دربدر ہو نہ جائے

کہیں لوٹ جائیں نہ وہ آتے آتے
دعا وصل کی بے اثر ہو نہ جائے

جو یکساں رہے اپنے قول و عمل میں
تو کیوں آدمی معتبر ہو نہ جائے

منّت کشِ ہر سایۂ دیوار نہیں ہم !
اِن دھوپ کے ٹکڑوں کی طرح یار نہیں ہم

سچ یہ ہے کہ سچ بات کہا کرتے ہیں منہ پر
اوروں کی طرح حاشیہ بردار نہیں ہم

اِس جرم پہ ٹھہرے نگہِ دہر میں معتوب
چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار نہیں ہم

ہیروں سے اُلجھتے ہیں عبث کانچ کے ٹکڑے
کہہ دو کہ میاں زینتِ بازار نہیں ہم

مانع ہے بہم ہونے میں فطرت کا تفاوت
دلدار نہیں آپ ، دِل آزار نہیں ہم

چمکائیں گے ہم دیکھنا ذرّوں کا مقدّر
سورج کو نگل جائیں وہ مینار نہیں ہم

جو ہم کو رِجھاتے ہیں شکیلؔ اُن سے یہ کہہ دو
یاروں کی طبیعت پہ ابھی بار نہیں ہم

جیسا اب ہوتا ہے یوں ہوتا نہ تھا
دوستی میں کل کوئی دھوکا نہ تھا

میں نے جب تک آپ کو دیکھا نہ تھا
میرے دل میں درد سا ہوتا نہ تھا

چاند کا بھی عکس دیکھا جھیل میں
خوب تھا لیکن تِرے جیسا نہ تھا

میں ہی میں تھا جستجو در جستجو
تو ہی تو افسانہ در افسانہ تھا

تیری یاد آتے ہوئے ڈرتی نہ تھی
میرے اندر اتنا سنّاٹا نہ تھا

اور تھے ناواقفیّت کے مزے
میں بھی خوش تھا تو بھی شرمندہ نہ تھا

اس کا دل رکھنا ضروری تھا شکیلؔ
ورنہ سچ پوچھو تو میں پیاسا نہ تھا

میں یہ سمجھوں گا کہ مامور ہوں سُلطانی پر
مِرے آقاؐ مجھے رکھ لیجئے دربانی پر

آج کی نسل جو آمادہ ہے من مانی پر
بدنما داغ ہے تہذیب کی پیشانی پر

یوں نہ اِترائیے دولت کی فراوانی پر
بل نہ آجائے کہیں وقت کی پیشانی پر

دِل فریبی تِری ہم کو نہ لبھاپائے گی
سیکڑوں داغ ہیں دُنیا تِری پیشانی پر

آج کے دورِ بلاخیز میں جو ہو کم ہے!
دشت حیران نہ ہو شہر کی ویرانی پر

چھوٹ کر قید سے پہنچوں گا چمن تک کیونکر
اتنی طاقت نہیں رکھتے مِرے زندانی پر

نہیں معلوم پریشانیِٔ خاطر کا سبب
سلوٹیں ڈھونڈ رہا ہوں تِری پیشانی پر

میری محنت مِرے خوابوں کو بدھائی دے گی
آپ جائیں نہ مِری بے سرو سامانی پر

تو نہیں ہے تو تِری یاد کا پَرتو بھی نہیں
دائرے بنتے بگڑتے نہیں اب پانی پر

سلوٹیں صاف بتادیتی ہیں دل کی باتیں
لوگ تحریر لئے پھرتے ہیں پیشانی پر

آسماں سر پہ اٹھا رکھّا ہے گونگوں نے شکیلؔ
آپ اِتراتے رہیں اپنی زباں دانی پر

جو نہ ہو نام سے تیرے وہ شروعات ہی کیا
شُکر پر ختم نہ ہو جو وہ مناجات ہی کیا

میں ہوں انسان اور انسان کی اوقات ہی کیا
تو اگر بخش نہ دے مجھ کو تو پھر بات ہی کیا

ایک زنجیر سے مربوط ہے انساں کا وجود
غمِ دنیا نہ ہو شامِل تو غمِ ذات ہی کیا

کوئی تو ہو جو دُعاؤں سے نوازے مجھ کو!
زندگی میرے مقدّر میں ہے صلوات ہی کیا

کیا بتائیں کہ گزرتے رہے کس دَور سے ہم
ضبطِ تحریر میں آجائیں تو حالات ہی کیا

جو ترے ذکر سے خالی رہے وہ دن کیا دن
جو تری یاد سے روشن نہ ہو وہ رات ہی کیا

جو نہ ہو تیرے توسّط سے وہ کیا زخم اے دوست
جو نہ ہو تیرے تعلق سے وہ سوغات ہی کیا

اُس کے ہاتھوں میں ذرا ساز تو آجانے دو!
وقت کی نبض نہ تھم جائے تو پھر بات ہی کیا

اپنے اسلاف کے مانند کوئی کام بھی کر!
ذِکر ماضی ہے فقط بہرِ مباہات ہی کیا

تو ہمیں راہ پہ لے آئے گا ، ناممکن ہے !
راہ لے اپنی زمانے تِری اوقات ہی کیا

پاؤں وہ کیا جو بھلائی کی طرف بڑھ نہ سکیں
دوسروں کو جو سہارا نہ دیں وہ ہاتھ ہی کیا

یہ تو سب اُسکا کرم اسکی عنایت ہے شکیلؔ
ورنہ میں کیا، مِرا فن کیا، مِری اوقات ہی کیا

جب ہماری بے کسی کا ذکر چھیڑا جائے گا
دیکھ لینا دوستوں کا عکس دھندلا جائے گا

یوں ہمارے حال پر رنجیدہ خاطر تو نہ ہو!
ہم سے تیری آنکھ میں آنسو نہ دیکھا جائے گا

وقت لے آئے نہ جب تک موت کی دہلیز پر
زندگی ہم سے ترا دامن نہ چھوڑا جائے گا

ہم اندھیروں کی شکایت کر کے پچھتائے بہت
کیا خبر تھی گھر ہمارا ہی جلایا جائے گا

ہے یہ اندیشہ کہ گمراہی میں پڑ جاؤ گے تم
ورنہ جب چاہو من و سلویٰ اُتارا جائے گا

لوٹ آئے اُس گلی سے ہم یہ حسرت ہی لیے
اب پکارا جائے گا بس اب پکارا جائے گا

ناز فرماتا رہے وہ لاکھ اپنے حُسن پر
جب بھی میری یاد آ جائے گی شرما جائے گا

جیسے جیسے میری وحشت رنگ لاتی جائے گی
ویسے ویسے اور اس کا قد نکلتا جائے گا

خلد کی رعنائیاں اپنی جگہ اے ماہ رُو !
تیرا کوچہ چھوڑ کر ہم سے نہ جایا جائے گا

ذِکر میرا چھیڑ کر تم اُس کا چہرہ دیکھنا
ایک سایہ آئے گا اور ایک سایہ جائے گا

ہر عمل ردِّ عمل کا پیش خیمہ ہے شکیلؔ
چھپنے والا اِک نہ اِک دن سامنے آ جائے گا

خود کو روک اُس گلی میں جانے سے
باز آ ، آ برو گنوانے سے!

عام ہونے لگی ہوس کاری
پیار اٹھنے لگا زمانے سے

آسماں کا نہیں بگڑتا کچھ!
چند تاروں کے ٹوٹ جانے سے

آشنا اس گلی میں کوئی نہیں!
ہم وہاں جائیں کس بہانے سے

بات بنتی نظر نہیں آتی !
زلف اُلجھی ہوئی ہے شانے سے

جب بگڑتا ہے وقت کا تیور
بات بنتی نہیں بنانے سے

کوئی ہوتا نہیں کسی کا شکیلؔ
فائدہ کیا فریب کھانے سے

کب آئے گا وہ شہرِ ستم گر سے پوچھئے
لایا ہے کیا پیام کبوتر سے پوچھئے!

ظاہر ہوا نہ ہو کہیں سوزِ شبِ فراق
یہ کیسے آبلے ہیں گُلِ تر سے پوچھئے !

ہم کیا بتائیں اپنی شجاعت کے واقعات
گزری ہے کیا غنیم کے لشکر سے پوچھئے

ہمسایوں تک پہنچتی ہے کیسے ہر ایک بات
دیوار کا جواز ہے کیا در سے پوچھئے

ملتا نہیں سکون سرابوں کے شہر میں
سایہ کہاں ہے دھوپ کی چادر سے پوچھئے

ہنستے نہیں ہیں پھول مہکتی نہیں فضا!
کب تک لہو رُلائے گا منظر سے پوچھئے

یونہی کسی کی قدر تو ہوتی نہیں شکیلؔ
دستِ ہنر کی بات ہے پتّھر سے پوچھئے

ہم کہاں پیشِ نظر نفع و ضرر رکھتے ہیں
بات جو حق ہے وہ بے خوف و خطر رکھتے ہیں

بد نہادوں سے بھلائی کی توقع ہے عبث
کیا ببولوں سے بھی اُمّیدِ ثمر رکھتے ہیں

ہم نشیں وقت بدلتے نہیں لگتی کچھ دیر
ہم بھی پوچھیں گے کہ وہ کتنا اثر رکھتے ہیں

واقعہ ہے کوئی افسانہ نہیں ہے اے دوست
بے ہنر ہو کے بھی کچھ لوگ اثر رکھتے ہیں

بزدلی سمجھو نہ ہم لوگوں کی خاموشی کو
پسِ خاکسترِ افسردہ شرر رکھتے ہیں

کیا ڈرائے گا ہمیں رات کا عِفریت شکیلؔ
جو اندھیروں کو نِگل لے وہ سحر رکھتے ہیں

اُس کا دھیان آتا ہے جذبوں کو ہوا دیتے ہوئے
چاہتا ہے دل وہی لمحے مزا دیتے ہوئے

دھیرے دھیرے گھٹ رہی ہے دیکھ میعادِ عمل
وقت آگے بڑھ رہا ہے یہ صدا دیتے ہوئے

یہ بھی کی تاکید بیٹا جھوٹ مت کہنا کبھی
ماں نے جب رخصت کیا اُس کو دُعا دیتے ہوئے

آج اُس پر بھی مسلّط ہے اندھیروں کا عذاب
کل بہت خوش تھا جو مُجھ کو رت جگا دیتے ہوئے

اشتیاقِ دید میں پتھرا گئیں آنکھیں شکیلؔ
یہ کہاں سوچا تھا اسکو آئینہ دیتے ہوئے

لعل و گوہر خریدنے والے
ماہ و اختر خریدنے والے

پیاس تیری کبھی بجھے گی نہیں
اے سمندر خریدنے والے

اپنے ہیرے سمیٹ لائے ہم
سب تھے کنکر خریدنے والے

پتھروں کو بھی دوست رکھتے ہیں
کانچ کے گھر خریدنے والے

تاج میں بیچنے کو نِکلا تھا !
سب مِلے سَر خریدنے والے

میری تہذیب دھیان میں رکھنا
اے مِرا گھر خریدنے والے

ہم تو بے مول بِک رہے تھے شکیلؔ
نہ مِلے پر خریدنے والے

بدنہادوں کو اگر مسندِ شاہی دیں گے
یہ ہمیں امن نہیں بلکہ تباہی دیں گے

لاکھ قاتِل کے خلاف آپ گواہی دیں گے
کوئی پابند ہیں منصف کہ سزاہی دیں گے

فتح کے جشن میں گونجے گا شہنشاہ کا نام
جان تو جنگ کے میداں میں سپاہی دیں گے

کون سا عیش میسّر تھا کہ ہو جس کا ملال
ہم تو اس بار بھی قاتل کو دُعا ہی دیں گے

کوچۂ یار ہے جاگیر نہیں ناصح کی
اب کے ٹوکے گا تو ہم اس کو سُنا ہی دیں گے

رُسوا کہیں نہ مجھ کو مِری بے خودی کرے
اُس انجمن میں پھر مِرا جانے کو جی کرے

بچّوں کی تربیت میں نہ کوئی کمی کرے
کچھ عاقبت کی فکر اگر آدمی کرے

شرمندہ ماہتاب ہے لرزیدہ شاخِ گُل
کِس کی مجال ہے کہ تِری ہم سَری کرے

معلوم ہو اُسے بھی گزرتی ہے دل پہ کیا
وہ بھی تو انتظار گھڑی دو گھڑی کرے

ہر چند برقرار ہے حالات کا دباؤ
روتے ہیں سب مگر مرا ہنسنے کو جی کرے

کم ظرفوں کے خلوص پہ رکھتا ہے اعتبار
کہدو کہ ریت پر نہ عمارت کھڑی کرے

کروٹ بدلتے رہتے ہیں حالات اے شکیلؔ
انساں کو چاہیئے کہ نہ باتیں بڑی کرے

مِرے لئے خس و خاشاک و خار رکھ دینا
مگر نصیب میں اسکے بہار رکھ دینا !

بلندیاں مِرے یاروں کو دے مگر یارب
طبیعتوں میں ذرا انکسار رکھ دینا

حَکَم بنا کے خوشامد طلب حلیفوں کو
کہیں نہ داؤں پہ اپنا وقار رکھ دینا

اِسی زمین سے میں پا برہنہ نکلا تھا!
اسی زمیں پہ مِرا اقتدار رکھ دینا

وطن میں رہ کے بھی لُطفِ وطن سے ہیں محروم
ہمارا نام غریب الدّیار رکھ دینا !

اندھیری رات کا افسوں جو توڑنا ہے شکیلؔ
کوئی چراغ سرِ رہ گزار رکھ دینا!

نظر سے دور رہا وہ مگر خبر میں رہا
کہ فاصلہ بھی میرے قرب کے اثر میں رہا

طلب کے ساتھ جسارت بہت ضروری ہے
وہ نامراد رہا جو اگر مگر میں رہا !

ضرورتوں کے تقاضے تھے اور شکستہ بدن
تمام عمر یہی معرکہ نظر میں رہا

لہو محاذ پہ بہتا رہا جوانوں کا
وہ جنگ چھیڑ کے محفوظ اپنے گھر میں رہا

تمام عمر رہا وصل ، کل کے وعدے پر
تمام عمر میں تزئینِ بام و در میں رہا

ہمیں نہیں تھے تجھے لوگ بھی تو دیکھتے تھے
یہ اور بات تفاوت نظر نظر میں رہا

میں اُس کے لمس کی لذّت بھلا سکا نہ شکیلؔ
وہ روشنی کی طرح میری رہ گزر میں رہا

بے وطن ہونے میں عجلت نہیں کرتا کوئی
تنگ جب تک نہ ہو ہجرت نہیں کرتا کوئی

ثبت ہے ثور پہ ایثارِ ابو بکرؓ ہنوز !
یوں ادا فرضِ رفاقت نہیں کرتا کوئی

ذکر کرتے ہیں سبھی اس کی گلی کا لیکن !
اس کے بارے میں روایت نہیں کرتا کوئی

کوئی تمثیل نہیں ہے ترے قامت کے لئے
بے سبب ذِکرِ قیامت نہیں کرتا کوئی

جن چراغوں نے اُجالوں کی بشارت دی تھی
ان چراغوں کی حفاظت نہیں کرتا کوئی

اپنے چہرے سے اُٹھاؤ نہ سرِ بزم نقاب
اس طرح وَا درِ دولت نہیں کرتا کوئی

پُشت پر وار ہوا کرتا ہے رہ رہ کے شکیلؔ
سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتا کوئی

شکستہ پا ہیں مگر تیز چل رہے ہیں ہم
اسی لئے تو زمانے کو کِھل رہے ہیں ہم

خدا نہ چاہے تو توقیر مل نہیں سکتی
اَنا کے زعم میں ناحق اُچھل رہے ہیں ہم

کسی کا وعدۂ شب تاب بھی قیامت ہے
چراغِ شام کے مانند جل رہے ہیں ہم

ہماری سادہ مزاجی کا مت مذاق اُڑا
سنبھال خود کو کہ تیور بدل رہے ہیں ہم

ہمارے ذکر سے معمور ہوگا شہرِ سخن
کہ لفظ لفظ غزل در غزل رہے ہیں ہم

خدا کے فضل سے محتاج ہم کسی کے نہیں
گرا رہا ہے زمانہ سنبھل رہے ہیں ہم

ہمیشہ رہتی ہے اپنی ہی فکر دامن گیر
کہاں کسی کے لئے ہاتھ مل رہے ہیں ہم

رفاقتوں کے تعلق سے یاد آئیں گے
کہ آپ اپنی جگہ بے بدل رہے ہیں ہم

مزاج ملتا نہیں ہے کسی کے ساتھ شکیلؔ
نہ جانے کون سے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم

وہ گھر میں خوشحالی لانے سات سمندر پار گیا
لیکن جب واپس آیا تو ساری خوشیاں ہار گیا

اپنے آپ سے شرمندہ ہوں ٹوٹ گیا معصوم کا دِل
ناحق میں اپنے بچے کو ساتھ لیے بازار گیا

بھرا ہوا تھا دلوں میں غُبار کیا کرتے
وہ رسم وراہِ وفا اِستوار کیا کرتے

وہاں تو سب کے ہی دامن پہ تھے گناہ کے داغ
وہ لوگ مجھ کو بھلا سنگسار کیا کرتے

بڑا یقین تھا دل کو کسی کے وعدے پر
ہم انتظار نہ کرتے تو یار کیا کرتے!

منافقت نہیں شامل ہماری فطرت میں
حریف ہم کو بھلا شرم سار کیا کرتے

یہ واقعہ ہے کہ اُس کو وفا نہیں آتی
شکیلؔ ہم کوئی قول و قرار کیا کرتے

ہم اس کو روح کی گہرائیوں سے چاہتے تھے
یہ بات سچ ہے مگر اشتہار کیا کرتے

ہلچل مچی ہے چاروں طرف گیر و دار کی
پیادے کے سر نہ آئے مصیبت سوار کی

اُٹھے ہیں لے کے خدمتِ خلقِ خدا کا نام
بیٹھی ہوئی ہے دل میں ہوس اقتدار کی

اے دوست کب کا بھول گیا ہوتا میں تجھے
ہوتی اگر یہ بات مِرے اختیار کی

بارش میں بھیگنے کا مزہ خوب ہے مگر
کچھ اور بات ہوتی ہے پہلی پھوار کی

کب تک مجھے یہ ابر کے ٹکڑے چھپائیں گے
سورج کو احتیاج نہیں اشتہار کی

بچّوں کو لاڈ پیار نے آوارہ کر دیا
حالت خراب ہوتی گئی کاروبار کی

یوں مصلحت کے نام پہ کب تک ڈریں شکیلؔ
لڑنی پڑے گی جنگ ہمیں آر پار کی

تو ابھی حرفِ طلب لب پہ نہ لا رہنے دے
خود کو ہر حال میں پابندِ وفا رہنے دے

ڈوبتے دیکھی ہے ساحل پہ بھی کشتی میں نے
ہم نشیں تذکرۂ موجِ بلا رہنے دے

آنے والوں کے لئے راستہ ہو جائے گا صاف
ہر قدم پر اثرِ لغزشِ پا رہنے دے

عافیت ہوگئی عنقا میں کہاں جاؤں گا
مِرے صیّاد نہ کر مجھ کو رہا رہنے دے

گر نہ جاؤں کہیں دنیا کی نظر سے اے دوست
دیکھ اتنا مجھے اوپر نہ اُٹھا رہنے دے

مسئلے عشق کے معلوم ہیں ہم کو ناصح
طاق پر اپنی کتابوں کو دھرا رہنے دے

میری رسوائی سراسر تری رسوائی ہے
تو مرا نام نہ لکھ لکھ کے مِٹا رہنے دے

ذِکر کرنا ہے تو کر ان کی اداؤں کا شکیلؔ
داستانِ گل و بلبل نہ سنا رہنے دے

اس کی دہلیز پہ کب اپنا اجارہ ہے شکیلؔ
وہ ہے مختار نہیں رہنے دے یا رہنے دے

○

ابر تھک جاتا ہے لیکن بھیگتا رہتا ہے گھر
آسماں بھی دے نہیں پاتا مِری چھت کا جواب

دُشمنوں سے بھی کریں گے دوستوں جیسا سلوک
ہم نہیں دیں گے عداوت سے عداوت کا جواب

وہ تِرا حُسن تِری شکل و شباہت نہ رہی
ترے انداز میں پہلی سی نزاکت نہ رہی

وہ دہکتے ہوئے رخسار کی حِدّت نہ رہی
وہ مہکتی ہوئی زلفوں کی لَطافت نہ رہی

وہ بھڑکتے ہوئے جذبات کا موسم نہ رہا
وہ اُمڈتے ہوئے ارمانوں کی کثرت نہ رہی

وہ جھجکتے ہوئے آنے کا طریقہ نہ رہا
وہ سمٹتے ہوئے ملنے کی روایت نہ رہی

تیرے شرمیلے تبّسم کے نظارے نہ رہے
میری بے باک نگاہوں کی شرارت نہ رہی

نہ رہا وہ ترا اندازِ نمک پاشئِ زخم!
وہ تِرے خنجرِ مژگاں کی جراحت نہ رہی

تو نے بھی چھوڑ دیا بننے سنورنے کا رواج
مجھ کو بھی اب تِری تعریف کی فرصت نہ رہی

نہ رہا کچھ بھی جو پہلے تھا مگر اے ہمدم
کیسے کہہ دوں کہ مجھے تجھ سے محبت نہ رہی

یادِ ایّامِ گذشتہ بھی قیامت ہے شکیلؔ
میری آنکھوں کو کسی خواب کی حسرت نہ رہی

ہر گذرتا پل نیا اِک مسئلہ دیتا گیا
جاتے جاتے مجھے جینے کی ادا دیتا گیا

فطرتاً مجبور تھے اپنی جگہ دونوں شکیلؔ
بد دُعا دیتا گیا وہ میں دُعا دیتا گیا

نارِوا ہو گیا ناسزا ہو گیا
سب بھلے ہو گئے میں بُرا ہو گیا

سارے دشمن عداوت سے باز آ گئے
دوستوں کے لئے مسئلہ ہو گیا

زندگی اور دشوار ہو جائے گی
مشکلوں کا اگر خاتمہ ہو گیا

مدّعی دِل کا ویسے بھی کوئی نہ تھا
آپ نے کہہ دیا آپ کا ہوگیا

جب نہیں یاد اس نے کیا ہے مجھے
زخمِ دل کس لئے پھر ہرا ہو گیا

اب وہ آئے تو کیا اور نہ آئے تو کیا
وقت سارا تو صرفِ دُعا ہوگیا

میں شکیلؔ اِس تغیّر پہ حیران ہوں
کیوں مخالف مِرا ہم نوا ہو گیا

پہلے اعتبار کیجئے
پھر کسی کو یار کیجئے!

دشمنی نکالیئے مگر
سامنے سے وار کیجئے

بخشنے کی بات کس نے کی
صید ہوں شکار کیجئے

داستاں طویل ہوگئی
کچھ تو اختصار کیجئے

شاعری بھی تاجری ہے آج
خود کو اشتہار کیجئے

کوربیں کو کیا دکھائی دے
روشنی ہزار کیجئے

آنے والا وقت ہوں شکیلؔ
میرا انتظار کیجئے

بوڑھے نقوش میں ہے جوانی پرت پرت
چھوڑے ہے عہدِ رفتہ نشانی پرت پرت

چہرہ کھلا ، لباس گھٹا ، آبرو لٹی !
مرتا گیا نگاہ کا پانی پرت پرت

عظمت گئی ، وقار گیا ، حوصلے گئے !!!
کھوتے گئے ہم اپنی نشانی پرت پرت

چاہت ہے کیا، خلوص ہے کیا، دوستی ہے کیا
ہم پر کھلے ہیں سب کے معانی پرت پرت

ہر رات ان کی یاد میں آنسو بہائے گی
چھوڑی ہے دِل جلوں نے کہانی پرت پرت

جنبش جو یار نے لبِ مُعجز بیاں کو دی
کھلنے لگے غزل کے معا نی پرت پرت

انسان ذات پات میں بٹتا رہا شکیلؔ
گھٹتی رہی کبیر کی بانی پرت پرت

ماحول نے ڈالا ہے اثر اور طرح کا
پھل اور طرح کے ہیں شجر اور طرح کا

لرزیدہ ملے وادئ ظلمات کے رَہرَو
آیا مِرے حصّے میں سفر اور طرح کا

دشمن کی ہر اِک چال سے بچ آیا میں لیکن
یاروں نے دکھایا ہے ہنر اور طرح کا

ہر بار بڑھا کرتی ہے بے تابئ دل اور
ہر بار وہ آتا ہے نظر اور طرح کا

مشتاق تو پہلے بھی بہت تھے مگر اب کے
مجمع ہے سرِ راہ گزر اور طرح کا

کیفیت کیسے کہوں موسمِ تنہائی کی
چھیڑ بھی دِل پہ گراں ہوتی ہے پُروائی کی

قید ہونا ہی مقدّر میں لکھا تھا ورنہ
چھاپ تھی دامنِ یوسفؑ پہ زلیخائی کی

جس کو آتا نہیں جذبات پہ قابو پانا
اُس سے اُمید نہ رکھو کوئی دانائی کی

یہ تو ظاہر ہے کہ مقبول ہے دُنیا داری
دیکھنا یہ ہے کہ کِس کِس نے پذیرائی کی

جب تلک تیری رضا جوئی رہی پیشِ نظر
ہے یہ تاریخ غلاموں نے بھی آقائی کی

میرے قاتل تو ذرا اپنا تعارف دے دے
تجھ سے ملتی ہے بہت شکل مِرے بھائی کی

اور ہوں گے جو حسد رکھتے ہیں سینوں میں شکیلؔ
ہم کو عادت نہیں یاروں سے حریفائی کی

آئینہ بھی بے صیقل و زنگار لگے ہے
اِس دور میں ہر کوئی ادا کار لگے ہے

شاید کوئی آیا ہے سرِ کوچۂ مقتل !!
تہوار کے جیسا کوئی تہوار لگے ہے

آسان نہیں ہے سفرِ قُلزمِ ہستی !
جو جان پہ کھیلے ہے وہی پار لگے ہے

اس درجہ تپش خیز ہے احساس کا سورج
برفیلا تبسّم بھی شرر بار لگے ہے

ہر لحظہ بدلتی ہوئی قدریں ارے توبہ
ہر لمحہ کوئی درپئے آزار لگے ہے

میرے لہجے میں جو انداز انا کا ہوتا
دوستوں نے مجھے سر پر نہ بٹھایا ہوتا

کوئی الزام جو مجھ پر نہیں آیا ہوتا
آدمی کا ہے کو ہوتا میں فرشتہ ہوتا

سب بتاتے ہیں کہ وہ ڈھونڈ رہا تھا مجھ کو
یوں جو ہوتا تو میرے گھر پہ بھی آیا ہوتا

صاحبو یہ نہ کہو بھول گیا ہے وہ مجھے
بات ہوتی تو مِرا ذِکر بھی آیا ہوتا

بد نظر اُٹھتی نہ بھولے سے تمہاری جانب
بیٹیو ، سر پہ تمہارے جو دوپٹّہ ہوتا

میرے ہونے سے ہی ہے تیری بڑائی کا بھرم
تو بڑا ہوتا کہاں میں جو نہ چھوٹا ہوتا

لوگ کہتے ہیں کہ وہ شہر میں آیا تھا شکیلؔ
ہم بھی مِل لیتے ذرا دیر جو ٹھہرا ہوتا

خود کو اپنی نظر سے گرایا نہیں
ہم نے کیچڑ کسی پہ اچھالا نہیں

نفسی نفسی کا عالم ہے چاروں طرف
ایسا لگتا ہے کوئی کسی کا نہیں

سخت مشکل میں ہوں کس سے تشبیہ دوں
شہر میں کوئی بھی تیرے جیسا نہیں

دشمنوں میں ہوں میں، دوستوں میں ہو تم
میں بھی تنہا نہیں، تم بھی تنہا نہیں

تیرگی کی شکایت تو کرتے ہیں سب
کوئی اپنے دیئے کو جلاتا نہیں

ہم نے اُن کو بُلایا تو ہے شوق سے
دیکھنا ہے وہ آتے بھی ہیں یا نہیں

میں نے میلوں سفر جس کی خاطر کیا
دو قدم چل کے مجھ تک وہ آیا نہیں

چاند تارے مِری راہ میں تھے مگر
کوئی تیرے سوا دِل کو بھایا نہیں

بات کیا اے شکیلؔ اسکے کوچہ میں ہے
جو گیا پھر پلٹ کر وہ آیا نہیں

لفظ کی جزویات سے باہر ہوتے نئیں
کہدیں تو پھر بات سے باہر ہوتے نئیں

عزّت ذلّت دینے والا اللہ ہے
ہم اپنی اوقات سے باہر ہوتے نئیں

تم جو چاہو تو مرے ہاتھ پر بیعت نہ کرو
ہاں مگر مجھ سے اُلجھنے کی جسارت نہ کرو

خیر خواہوں میں ہو تم ، مجھ کو ہے تسلیم مگر
کام کی بات کرو، صرف نصیحت نہ کرو

وقت کی دھوپ نے ڈالا ہے اثر دونوں پر
میں بھی شکوہ نہ کروں تم بھی شکایت نہ کرو

مُفلسی نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے
چاک دامانی سے اندازۂ وحشت نہ کرو

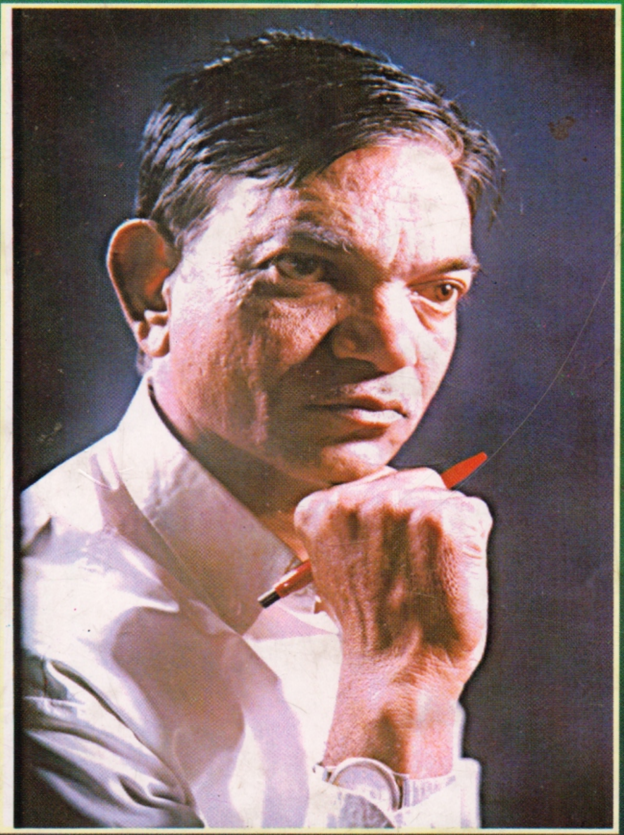
آتشِ شوق کو کچھ اور ہوا ملتی ہے
جب وہ شرما کے یہ کہتے ہیں شرارت نہ کرو

اب کہاں قدر شناسی کا زمانہ ہے شکیلؔ
کوئی مِل جائے خریدار ،تو قیمت نہ کرو

Khusboo Ka Badan

(Poetry)

Shakeel -Ibn-Sharaf



کچھ دائرے پانی پہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے
میں جھیل میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح تھا

بزمِ محبّانِ شکیل پبلی کیشنز مچھلی بازار، دھولیہ، ۴۲۴۰۰۱

BAZM-E-MUHIBBAN-E-SHAKEEL PUBLICATIONS,

Machchli Bazar, Dhule 424001